تحریک اسلامی ہند

مولانا صدرالدین اصلاحی

فهرست مضامین

مقدمہ	**۷**
پس منظر	**۹**
نام	۹
حقیقی پس منظر	۹
ہنگامی محرکات	۱۴
نوعیت	۲۴
نصب العین	**۲۷**
اصولی اور دستوری تعبیر	۲۷
وضاحت طلب اُمور	۲۸
(۱) دین سے مراد صرف دین اسلام	۲۸
(۲) خالص اصولی نوعیت	۳۰
(۳) دین کے مفہوم کی حدیں	۳۰
(۴) اقامت کا مفہوم	۳۱
(۵) غایت مقصود	۳۲
(۶) دنیوی فلاح کی بہترین ضمانت	۳۳
(۷) مطلوبہ معیار	۳۴
مخاطب	**۳۶**
دعوت کی ہمہ گیری	۳۶
ایک فطری تقسیم	۳۷
(۱) مسلمان اور ان کی تحریکی اہمیت	۳۸
(۲) غیر مسلم اور ان کی تحریکی اہمیت	۴۱

طریق دعوت	**۴۵**
دعوت کا بنیادی وصف	۴۵
دعوت کا راست انداز	۴۶
بنیادی اور اصولی طریقے	۴۶
افادی طریقہ	۵۱
طریق کار	**۵۵**
طریق کار کی اہمیت	۵۵
طریق کار کی بنیاد، کتاب وسنت	۵۵
اخلاق اور دیانت داری کا التزام	۵۷
پرامن اور تعمیری روش	۵۸
فرقہ پرستی اور طبقاتی کش مکش سے اجتناب	۶۰
تبلیغ وتلقین پر انحصار	۶۱
جماعتی نظام	**۶۳**
جماعتی نظام کی ضرورت	۶۳
عملی شکل	۶۵
(۱) تحریک کی رکنیت	۶۵
(۲) جماعتی نظام کا ڈھانچہ	۶۸
نظامِ جماعت کی شورائیت	۷۰
نظم کی پابندی	۷۳
ارکان کی تربیت	**۷۵**
تربیت کا مفہوم	۷۵
ضرورت اور غایت	۷۶
تربیت کا عملی نظام	۷۸

میدان عمل کی تربیت ۷۹
معیار مطلوب ۸۱
جماعتی نظام کی تطہیر ۸۲

تحریک اسلامی اور موجودہ نظام اجتماعی ۸۴

ضروری سوال ۸۴
موجودہ نظام سیاست کی نظریاتی بنیادیں ۸۴
اسلام کے بنیادی سیاسی تصورات ۸۶
تحریک اسلامی کی نظر میں موجودہ نظام کی حیثیت ۸۸
رضا کارانہ تعاون سے معذوری ۸۸
ملکی قوانین کی عملی پابندی ۹۱
موجودہ نظام کے خلاف عملی جدو جہد کا طریقہ ۹۳

مخالفتوں کا محاذ ۹۵

مخالفتوں کا لازمی ظہور ۹۵
اسباب ومحرکات ۹۶
(الف) عام وہمہ گیر اسباب ۹۷
(ب) مخصوص اور محدود نوعیت کے اسباب ۹۹
مخالفتوں سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت ۱۰۴
قرآن کی اصولی ہدایتیں ۱۰۴
مخالفتوں کے جواب میں تحریک کا رویہ ۱۰۶

اہم ملّی وملکی مسائل ۱۱۵

مسائل کی دعوتی اہمیت ۱۱۵
مسائل کی طرف عملی توجہ کی محدودیت ۱۱۷
مسائل کی اصولی تقسیم ۱۱۸
(ا) اہم تر مسائل ۱۱۹

عملی سرگرمیوں کا خاکہ ١٢٦
(٢) دوسرے مسائل ١٣٣

تحریک اسلامی اور مسائل ملک وملت کا عملی حل ١٣٥

مسائل کب حل ہوا کرتے ہیں؟ ١٣٥
تحریکی دور میں مسائل کے عملی حل سے معذوری ١٣٧
ایک خاص اور محدود استثناء ١٣٨
تحریک اسلامی کا امتیاز ١٣٩

تحریک اسلامی اور ملّی اتحاد ١٤٣

تحریکی نظام جماعت کی حیثیت ١٤٣
فقہی وسعت نظر ١٤٦
فرقہ ساز نہیں، باعث اتحاد ١٤٨

نقشہ کار ١٥٠

اسوۂ انبیاء کی مکمل پیروی ١٥٠
انبیائی دعوتوں کی قسمیں ١٥١
انبیائی دعوتوں کے نقشہ ہائے کار: ١٥٣
(١) اہلِ شرک وکفر کے درمیان ١٥٣
(٢) اہل کتاب وشریعت کے درمیان ١٦١
(٣) بیک وقت اہل کفر واہل کتاب دونوں گروہوں کے درمیان ١٦٦
(٤) نبی آخر الزماںؐ کا نقشۂ کار ١٦٧
تحریک اسلامی ہند کا نقشۂ کار ١٧١

بسم اللہ الرحمن الرحیم

مقدمہ

تحریک اسلامی ہند اس ملک کی ایک معروف اور کافی پرانی تحریک ہے۔ یہ تقریباً ایک تہائی صدی سے اقامتِ دین کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے اور اب یہاں کے بہت کم علاقے ایسے رہ گئے ہیں جہاں اس کی آواز نہ پہنچ سکی ہو۔ اس طویل مدت کے دوران یہ اپنے اصول و مقاصد کی، ہر ضروری اور ممکن پہلو سے، مسلسل توضیح و تفہیم بھی کرتی رہی ہے۔ ان دونوں باتوں کے مدنظر بظاہر توقع اسی بات کی کی جاسکتی تھی کہ اب یہ تحریک لازماً ایک جانی پہچانی چیز، بلکہ پڑھے لکھے لوگوں کے لیے ایک 'کھلی کتاب' بن چکی ہوگی۔ لیکن فی الواقع ایسا بہت کم ہوسکا ہے، کچھ تو اپنی مخصوص نوعیت کے باعث اور زیادہ تر دوسروں کی کم اعتنائیوں کے سبب یہ آج بھی اکثر ذہنوں کے لیے ایک 'بند کتاب' ہی کی حیثیت رکھتی ہے یا پھر ان کے سامنے جب آتی ہے اس کی ناقص بلکہ الٹی تصویر ہی آتی ہے۔ یہ صورت حال اس بات کا شدت سے مطالبہ کر رہی تھی کہ تحریک کے واضح تعارف کے لیے ایک ایسی جامع کتاب تیار کر دی جائے جس میں اس کے سارے اہم امور و مسائل اچھی طرح روشنی میں آگئے ہوں، تاکہ تحریک کو پورے اور صحیح طور پر سمجھ لینے کے لیے ساری ضروری تفصیل ایک ہی جگہ مل جائے۔ یہ کتاب اسی اہم مقصد سے لکھی گئی ہے۔ امید ہے کہ اس کے مطالعے کے بعد تحریک کا کوئی بنیادی مسئلہ اور گوشہ تاریکی میں نہ رہ جائے گا۔

چونکہ مقصد صرف یہ تھا کہ تحریک اسلامی سے ضروری لیکن واضح واقفیت حاصل کر لینے کے لیے لوگوں کے ہاتھ میں ایک جامع کتاب دے دی جائے، اس لیے قدرتی طور پر جزئیات اور فروعی مباحث میں جانے سے اجتناب کیا گیا ہے اور بحث کو صرف اصولی مسائل ہی تک محدود رکھا گیا ہے۔ کیونکہ فروعی بحثوں میں جانا غیر ضروری طوالت کا باعث ہوتا۔ اصولی باتوں کو تفصیل

سے سمجھ لینے کے بعد فروعی امور کے بارے میں تحریک کے نقطۂ نظر اور موقف کا اندازہ بھی خود بخود ہو ہی جائے گا۔

تحریک کے 'نقشۂ کار' کی بحث مختلف وجوہ سے ایک خاص اہمیت رکھتی تھی اور اس کی تعیین کا مسئلہ ایک پیچیدہ مسئلہ تھا۔ جب آج 'اقامت دین' کا نصب العین ہی ایک 'متبرک یادگار' بن کر رہ گیا ہے تو اس کے کام کے نقشے کے بارے میں عام ذہن کسی راست فکری کا ثبوت آسانی سے کیسے دے سکتے ہیں؟ اس لیے ضروری معلوم ہوا کہ اس بحث کے سلسلے میں کافی دور پیچھے جا کر ساری مختلف النوع انبیائی دعوتوں کے مختلف نقشہ ہائے کار سامنے رکھ لیے جائیں اور پھر ان سب کی روشنی میں، آج کے حالات کے انطباق کے لحاظ سے، تحریک کا نقشۂ کار واضح کیا جائے، تاکہ اس کے صحیح اور موزوں ہونے پر ہر شخص کو اطمینان حاصل ہو سکے۔

صدرالدین اصلاحی

۱۹؍جنوری ۱۹۷۰ء

پس منظر

نام

"تحریک اسلامی ہند" اس تحریک کا نام ہے جو بے کم وکاست پورے دین اسلام کے قائم کرنے اور باطن سے لے کر ظاہر تک پوری انسانی زندگی کو اسی کے سانچے میں ڈھال دینے کے لیے اس ملک میں جاری کی گئی ہے۔ اپنے نصب العین اور دائرۂ کار کے لحاظ سے وہ اسی نام کی مستحق تھی اور یہی نام تھا جو اس کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور حسب حال ہوسکتا تھا۔ اگر یہ نصب العین کچھ محدود قسم کا ہوتا یا دائرۂ کار محض اسلام کے بعض اجزاء کی تبلیغ واشاعت ہی تک پہنچ کر رک گیا ہوتا تو یہ نام اس تحریک کی اصل حیثیت سے یقیناً بڑھ کر ہوتا اور ایسی حالت میں اسے ناموزوں بلکہ تعلّی آمیز ٹھہرانا بھی غلط نہ ہوتا۔ لیکن جب صورتِ واقعہ یہ نہیں تھی اور اسلام کے صرف بعض اجزاء کی نہیں، بلکہ اس کے پورے وجود کی اشاعت اور اقامت اس کا مطمح نظر تھی تو موزوں ہی نہیں ضروری بھی تھا کہ اس کا نام صرف تحریک اسلامی رکھا جاتا۔ دوسرا کوئی بھی نام اس کی اصل حیثیت کی عکاسی سے لازماً قاصر رہتا اور اس وقت اگر کوئی بات ناموزوں اور قابل اعتراض ہوسکتی تھی تو صرف یہ کہ اس تحریک کا نام تحریک اسلامی کیوں نہیں رکھا گیا؟

حقیقی پس منظر

اس تحریک کا حقیقی پس منظر (جو فی الواقع اس کا حقیقی محرک بھی ہے) امّت مسلمہ کا وہ منصبی فریضہ ہے جس کی انجام دہی کے لیے وہ وجود میں لائی گئی ہے اور جو اپنی اصل کے لحاظ سے

اتنا ہی قدیم ہے جتنا کہ خود انسان اور اس کا دین، اسلام قدیم ہے۔ قرآن حکیم نے، جو اس تحریک کا اصل سرچشمہ ہے، نوعِ انسانی کے وجود اور اس کی غایتِ مقصود کے بارے میں جن بنیادی حقائق کا اظہار فرمایا ہے، ان میں سے درج ذیل امور کو ترتیب وار غور سے دیکھیے:

(۱) انسان صرف اس لیے پیدا کیا گیا ہے کہ اپنے پیدا کرنے والے کی، جو اس کا پروردگار ہے اور آقا و حاکم بھی ہے، 'عبادت' کرے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ. (ذاریات:۵۶)

(میں نے جن اور انسانوں کو اس کے سوا کسی کام کے لیے پیدا نہیں کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔)

(۲) 'عبادت' کا طریقہ اور اس کا معیار مطلوب انسان کے لیے از خود معلوم کر لینا ممکن تھا اور نہ وہ اس کا ذمہ دار بنایا گیا تھا، بلکہ اس کی یہ سب سے اہم ضرورت بھی اس کے اسی ربِّ کریم کی طرف سے پوری کی جا سکتی تھی اور پوری کی گئی، جس نے اسے اور سب کچھ عنایت فرمایا تھا۔

اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى. (اللّیل:۱۲)

(بے شک راستہ بتانا ہمارے ذمہ ہے۔)

یہ اس کی حکمت، رحمت اور ربوبیت کے بالکل منافی تھا کہ جب اس نے اس کے لیے ہوا، پانی، روشنی، غذا، لباس، غرض کسی بھی مادی ضرورت کے مہیّا فرمانے میں تاخیر سے کام نہیں لیا تو اس کی اخلاقی اور روحانی ضرورت کے بارے میں کسی تاخیر کو روا رکھتا۔ چنانچہ اس زمین پر جب پہلا انسان آیا تو اللہ کی 'عبادت' کا صحیح علم بھی اسے عطا ہو چکا تھا۔

قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّيْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. (البقرۃ: ۳۸)

(ہم نے کہا کہ تم سب یہاں سے اتر جاؤ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمہارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔)

یہی علم ہے جسے اللہ کا دین کہا جاتا ہے۔

(۳) یہ دین صرف ابتداء ہی میں اور صرف ایک ہی بار انسان کو عطا نہیں ہوا ہے، بلکہ

حسبِ ضرورت بار بار عطا ہوتا رہا ہے اور مختلف ملکوں اور قوموں میں برابر نازل ہوتا رہا ہے۔

وَاِنْ مِّنْ اُمَّةٍ اِلَّا خَلَا فِيْهَا نَذِيْرٌ ○　　(فاطر: ۲۴)

(اور کوئی امّت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی تنبیہ کرنے والا نہ آیا ہو۔)

پھر اجمال و تفصیل کے فرق اور جزئیات کے اختلاف کے باوجود یہ دین بنیادی امور کی حد تک ہمیشہ ایک ہی رہا ہے، جیسا کہ ایک ہی رہنے کا حق بھی تھا۔

شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ ○　　(الشوریٰ: ۱۳)

(اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔)

(۴) یہی 'علم' اور یہی 'دین' ہے جو قرآن کی شکل میں نازل ہونے کے بعد 'اسلام' کے نام سے موسوم ہوا:

وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا. (المائدۃ: ۳)

(اور تمہارے لیے اسلام کو تمہارے دین کی حیثیت سے قبول کر لیا ہے۔)

اس طرح اپنی اصل اور بنیادی تعلیمات کے اعتبار سے اسلام ہی وہ دین ہے جو انسانوں کے لیے ہمیشہ نازل ہوتا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ شروع سے آخر تک اللہ ربّ العالمین کی طرف سے جتنے دین بھی آئے، وہ سب کے سب اپنے جدا جدا ناموں، اپنی الگ الگ زبانوں اور اپنی مختلف شکلوں کے باوجود اپنی روح، اپنی حقیقت، اپنے اصول اور اپنی غایت کے اعتبار سے فی الواقع اسلام ہی تھے۔

(۵) قرآن اور 'اسلام' اس سلسلۂ ہدایت کی آخری کڑی ہیں۔

وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ.　　(الاحزاب: ۴۰)

(مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں۔)

اس دین کے بعد اب کوئی دوسرا دین نہ آئے گا۔ وہ ہمیشہ کے لیے ہے اور ساری دنیا کے لیے ہے۔

وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَافَّةً لِّلنَّاسِ بَشِیْراً وَّنَذِیْراً (سبا:۲۸)

(اے نبی تم کو تمام ہی انسانوں کے لیے بشیر ونذیر بنا کر بھیجا ہے۔)

اپنی آمد کے وقت سے لے کر دنیا کے وجود کی انتہا تک پوری نوعِ انسانی کے لیے ہدایت کا واحد سرچشمہ بھی وہی ہے اور نجات کا واحد ذریعہ بھی، اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْاِسْلَامِ دِیْناً فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ ہ (آل عمران:۸۵)

(اس فرماں برداری (اسلام) کے سوا جو شخص کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہے اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا اور آخرت میں وہ ناکام ونامراد رہے گا۔)

(۶) اس 'عبادت' کی، جس کے لیے انسان پیدا کیا گیا ہے، صحیح اور قابل قبول عملی شکل ہمیشہ یہی رہی ہے اور عقلاً بھی صرف یہی ہو سکتی تھی، کہ اللہ کے دین کی، کسی تفریق اور استثناء کے بغیر مکمل پیروی کی جائے۔ یہ دین جب بھی نازل ہوا، وقت اور مخاطب قوم کے تمدنی حالات کے لحاظ سے پوری زندگی کے لیے جامع ہدایتوں پر لازماً مشتمل رہا ہے۔ اس لیے اس کی 'مکمل پیروی' کے معنیٰ ہر زمانے میں یہی تھے کہ زندگی کے ظاہری وباطنی سارے پہلوؤں اور انفرادی و اجتماعی سبھی شعبوں کو اس کی ہدایتوں کے سانچے میں ڈھال دیا جائے۔ قرآن حکیم نے اس 'مکمل پیروی' کی تعبیر ''دین کی اقامت'' سے کی ہے۔

شَرَعَ لَکُمْ مِّنَ الدِّیْنِ مَاوَصّٰی بِهٖ نُوْحاً وَّالَّذِیْٓ اَوْحَیْنَآ اِلَیْکَ وَمَا وَصَّیْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰی وَعِیْسٰٓی اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ وَ لَاتَتَفَرَّقُوْا فِیْهِ ہ (الشوریٰ: ۱۳)

(اس نے تمہارے لیے دین کا وہی طریقہ مقرر کیا ہے جس کا حکم اس نے نوح کو دیا تھا اور جسے (اے محمدؐ) اب تمہاری طرف ہم نے وحی کے ذریعہ سے بھیجا ہے اور جس کی ہدایت ہم ابراہیمؑ اور موسیٰؑ اور عیسیٰؑ کو دے چکے ہیں، اس تاکید کے ساتھ کہ قائم کرو اس دین کو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ۔)

اس تعبیر کی روشنی میں حقیقت یہ قرار پائی کہ اللہ تعالیٰ نے جس دور میں بھی اور جس

انسانی گروہ کو بھی اپنا دین عطا فرمایا تھا، اس سے اس کا مطالبہ یہی رہا ہے کہ وہ اسے اپنی پوری زندگی پر 'قائم' کرے، اور برابر قائم رکھے۔ صرف اسی طرح وہ اس 'عبادت' کا حق ادا کرسکتا تھا، جو سارے انسانوں کی طرح اس کی بھی پیدائش کا مقصودِ کل تھا۔

(۷) جہاں تک اللہ کے دین کے اس آخری ایڈیشن (قرآن اور اسلام) کا تعلق ہے اس کے بارے میں اس کا یہ مطالبہ غیر معمولی اور دوگونہ قسم کا ہے۔ یعنی اس کے ماننے والوں کی ذمہ داری صرف اتنی ہی نہیں ہے کہ وہ اس کو اپنی پوری زندگی پر قائم کریں اور قائم رکھیں، بلکہ یہ بھی ہے کہ نوعِ انسانی کے باقی تمام دوسرے گروہوں تک اسے پہنچائیں، اس کی حقانیت اور ضرورت انہیں سمجھائیں، اسے قبول کرنے کی انھیں دعوت دیں اور اس طرح پوری دنیا پر اسے قائم کردینے کی مسلسل جدوجہد کرتے رہیں۔

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَّسَطاً لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ ۝
(البقرہ:۱۴۳)

(اور اس طرح تو ہم نے تم مسلمانوں کو ایک امّتِ وسط بنایا ہے، تا کہ تم دنیا کے لوگوں پر گواہ ہو اور رسول تم پر گواہ ہو۔)

گویا ان کی ذمہ داری وہ بھی ہے جو ہر امّت کی رہا کرتی تھی اور وہ بھی ہے جو انبیاء علیہم السلام کی رہتی رہی ہے۔ ان دونوں ہی ذمہ داریوں کی انجام دہی اس امّت کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ یہی اس کی زندگی کا واحد فریضہ ہے اور یہی اس کی وہ عبادت ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔

ان سب بنیادی حقائق کو نظر میں رکھیے، پھر موجودہ عالمِ انسانی کے اندر ان کی عملی کارفرمائی اور مقبولیت کا جائزہ لیجیے، صورت حال بڑی عجیب اور انتہائی افسوسناک دکھائی دے گی۔ عام گروہوں اور ملتوں کا کیا ذکر، وہ تو ان حقائق کی شاید ابجد سے بھی واقف نہیں، خود اس امت مسلمہ کی بھی اِن سے صحیح واقفیت اور عملی وابستگی حیرت انگیز حد تک کم یاب ہوچکی ہے جو اُن کی علمبرداری ہی کے لیے وجود میں آئی تھی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے وہ اپنے کو بھول سی گئی ہے۔ چنانچہ آج اُسے دیکھ کر کوئی یہ محسوس بھی نہیں کرسکتا کہ اس کی زندگی کا کوئی خاص مشن بھی ہے اور وہ دنیا کی دوسری تمام قوموں ہی جیسی ایک قوم یا ملت نہیں ہے۔ کیونکہ دوسرے بندگان خدا کو دین

حق کی روشنی دکھانے اوران کی زندگیوں کواس نور سے منور کر دینے کی فرض شناسانہ جدوجہد تو دور رہی، خود اس کی اپنی ہی زندگی بڑی حد تک تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہے، خصوصاً اس کے اجتماعی مسائل میں تو اس نورِ حق کا کوئی پرتو مشکل ہی سے دکھائی دے سکے گا۔

کوئی شک نہیں کہ یہ پوری صورتِ حال دنیا بھر کے پیروانِ اسلام کے خلاف ایک انتہائی بھیانک قسم کی' فردِ قراردادِ جرم' بنی ہوئی ہے اوران سے مطالبے پر مطالبے کر رہی ہے کہ اسلام اور قرآن کی پیروی کا دعویٰ رکھنے والو! اپنے کو پہچانو، اللہ کے دین کی اقامت کا اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنے کے لیے پھر سے وقف ہو جاؤ جس کے سوا اس زمین پر تمہاری زندگی کا دوسرا کوئی مقصد و مصرف نہیں اور جسے چھوڑ بیٹھنے کے نتیجے میں مدتوں سے تمہارا وجود یکسر بے معنیٰ ہو کر رہ گیا ہے۔ اس مطالبے کے لیے دوسرے ممالک کی طرح اس ملک کے مسلمانوں میں سے بھی کچھ لوگوں کے کان توفیق الٰہی نے کھول دیے اور انھوں نے اپنی تمام تر ناتوانائیوں کے باوجود فرض کی اس پکار پر لبیک کہتے ہوئے اس کے لیے عملی جدوجہد کا عزم کر لیا اور اس غرض سے، جیسا کہ ضروری تھا، ایک منظّم تحریک کا آغاز کر دیا۔[1]

ہنگامی محرکات

اگرچہ حقیقت واقعی بنیادی طور پر یہی ہے اور اس تحریک کا اصل پس منظر اور حقیقی سبب ادائے فرض کا یہی احساس تھا، لیکن امر واقعہ یہ بھی ہے کہ اس موقع پر حالات زمانہ نے کچھ ایسے اسباب اور بھی فراہم کر دیے تھے جنھوں نے خود اس احساس فرض کے لیے مہمیز کا کام دیا، اور جو ہنگامی طور پر اس تحریک کے حق میں بڑے زبردست محرک ثابت ہوئے۔

یہ محرکات تین قسم کے تھے: ملّی، وطنی اور عالمی۔ ان میں سے پہلا محرک سب سے اہم، نمایاں اور مؤثر تھا، باقی نسبتہً ثانوی درجے کے اور کم نمایاں تھے۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے:

(۱) ملی نوعیت کے ہنگامی محرک کو سمجھنے کے لیے اس صدی کی دوسری چوتھائی کی ملکی

---

[1] یوں تو اس تحریک کے لیے زمین کافی دنوں سے تیار کی جارہی تھی اور اس کی ضرورت کا احساس پیدا کرنے کا اور اس کے اصول و افکار کی تبلیغ و اشاعت کا ٹھوس علمی کام ایک مدت سے (تقریباً ۱۹۳۲ء ہی سے) انجام پا رہا تھا، لیکن عملی شکل میں اس کا آغاز ''تحریک دارالاسلام'' کے نام سے ۱۹۳۹ء میں پٹھان کوٹ کے قریب ایک چھوٹے سے مقام پر ہوا۔ پھر اگست ۱۹۴۱ء میں اس کی نئے سرے سے تنظیم ہوئی اور اب ''جماعت اسلامی'' نام کی تنظیم کے ساتھ اس کا سفر شروع ہوا۔

تاریخ پر نظر ڈالیے۔ یہ وہ زمانہ ہے جس کے ابتدائی حصے میں ہندوستان کی تحریک آزادی اپنے شباب کو پہنچ رہی تھی، انگریز کی غلامی کو اب مزید برداشت کرنے سے یہ ملک بڑے شدید انکار کا مظاہر کررہا تھا، اور اس انکار سے بغاوت کے شعلے بھڑکنے لگے تھے۔ آزادئ وطن کی یہ پُرشور تحریک ملک کے سبھی گروہوں اور ملتوں کی دلی آرزوؤں کا نشان بنی ہوئی تھی۔ بلکہ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق تھا، ان کے لیے تو وہ ایک دینی ضرورت اور اسلامی فریضہ بھی تھی، کیونکہ ملک کے دروبست پر ایک سامراجی اور دشمن اسلام طاقت کا مسلط رہنا ان کی صرف قومی غیرت اور وطنی حمیت ہی کو نہیں پامال کیے ہوئے تھا، بلکہ ان کے دین کو بھی ان کی زندگی کے نظام سے بے دخل کیے ہوئے تھا۔ اس لیے اس تسلط کا ختم ہونا فطری طور پر جتنا انھیں مطلوب ومحبوب ہوسکتا تھا دوسروں کے لیے ہرگز نہیں ہوسکتا تھا۔ غرض ایک عام اور ہمہ گیر جوش وخروش ہر طرف بپا تھا، جس کے نتیجے میں آزادی کی یہ تحریک کامیابی کی منزلیں طے کرتی ہوئی بالآخر ایک ایسے مقام تک پہنچ گئی جہاں سے صبح آزادی کی پوپھٹتی صاف دکھائی دینے لگی تھی۔ اس لیے اب قدرتی طور پر اس کا مثبت تقاضا بھی سامنے آگیا۔ اب تک تو فکر وعمل کی پوری توجہ صرف اس بات پر مرکوز تھی کہ برطانوی سامراج کا خاتمہ اور ہندوستان آزاد ہو۔ مگر کامیابی کے آثار نظر آتے ہی فطری طور پر یہ مسئلہ بھی غور وفکر اور بحث وگفتگو کا موضوع بن گیا کہ آزادی کے بعد اس ملک کا نظام کیسا اور کن بنیادوں پر قائم ہونا چاہیے؟ ظاہر ہے کہ اتنے وسیع ملک میں اور اتنی بڑی آبادی کی طرف سے اس اہم ترین سوال کا کوئی متفقہ جواب ملنا کسی طرح متوقع نہیں تھا۔ چنانچہ مختلف سیاسی پارٹیوں، معاشی طبقوں اور ملّی گروہوں نے ملک کے آیندہ نظام کے بارے میں مختلف نظریوں اور عزائم کا اظہار شروع کردیا۔ جن میں سے دو نظریے مسلمانوں کے لیے خاص طور سے سب سے زیادہ اہم تھے، کیونکہ ملک وملت کی فضا پر عام طور سے وہی چھائے ہوئے تھے۔

ایک نقطۂ نظر تو انڈین نیشنل کانگریس کا تھا۔ اس کا کہنا یہ تھا کہ ہندوستان میں صرف ایک قوم بستی ہے، جس کی ایک مشترکہ تہذیب ہے۔ اس لیے یہاں ایک سیکولر جمہوری نظام حکومت قائم ہونا چاہیے۔

دوسرا نقطۂ نظر آل انڈیا مسلم لیگ کا تھا۔ جو کہتی تھی کہ اس ملک میں ایک نہیں کئی قومیں

آباد ہیں۔ ان میں مسلمان بھی ایک قوم ہیں، ان کی اپنی ایک الگ اور مستقل تہذیب ہے۔ اس لیے ان کا سیاسی مستقبل مسلم قومیت اور تہذیب کی بنیاد پر تعمیر ہونا چاہیے۔

مسلمانوں کی تقریباً پچانوے فیصد اکثریت انہی دونوں پارٹیوں میں شامل تھی اور انہی دونوں تحریکوں کی علم برداری یا خدمت گزاری میں ہمہ تن مصروف تھی۔ گویا اس وقت ہندوستان میں مسلمانوں کی دو ہی قسمیں تھیں۔ اگر کوئی مسلمان تھا تو وہ یا کانگریسی[1] تھا یا مسلم[2] لیگی[1]۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عام ہندوستان ہی کی نہیں، خود مسلمانوں کی بھی تعمیر انہی دو پارٹیوں میں سے کسی ایک کے نظریات کے مطابق، کرنے کا فیصلہ کرلیا گیا تھا۔ حالانکہ یہ دونوں ہی اپنی ہندوستانیت یا اسلامیت کی چھاپ کے باوجود، اپنی حقیقت میں خالص مغربی اندازِ فکر کی پارٹیاں تھیں۔ وہی مادی نقطۂ نظر، وہی قوم پرستانہ طرزِ فکر اور وہی افادی معیارِ انتخاب، جو مغربی تہذیب اور فلسفۂ عمران کی اساس ہیں، اپنے اپنے رنگ میں ان تحریکوں کا بھی سرمایۂ حیات تھے۔ اس لیے ان میں سے پہلی تحریک اپنے متوقع فطری نتائج کے اعتبار سے اگر اسلام اور اسلامی تہذیب کے لیے انتہائی سنگین خطرات کی حامل تھی تو دوسری بھی کسی طرح قابلِ قبول نہیں تھی۔ پہلا نقطۂ نظر ہندوستان کا ایک ایسا مستقبل پیش کررہا تھا جس کی بنیادوں میں خدائی ہدایات کا نام و نشان تک نہ تھا، بلکہ واضح طور پر دین بےزار اصولوں پر تعمیر ہونے والا تھا۔ اس لیے اس نقطۂ نظر کا برسرِ اقتدار آجانا دینی لحاظ سے ایک عظیم حادثہ ہی سمجھا جاسکتا تھا۔ اسی طرح دوسرا نقطۂ نظر اگرچہ مسلمان اور مسلم تہذیب ہی کا نہیں، اسلام کا بھی نام پوری بلند آہنگی اور جوشِ عقیدت سے لے رہا تھا، مگر اس کے اندر بھی، اسلام فی الواقع پیچھے تھا اور مسلم قوم آگے تھی۔ چنانچہ اس کی تنظیم کی نوعیت، اس کی عام قیادت، اس کے مطالبات اور اس کے طریقِ کار میں سے ہر چیز اس حقیت کی نمایاں شہادت دے رہی تھی۔

اب ایک طرف تو ہندوستان، خاص کر ہندی مسلمانوں کی تاریخ کے اس نازک موڑ کو

---

[1] اس صورتِ حال کا اندازہ ایک واقعے سے کیجیے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے کی بات ہے۔ راقم الحروف ایک بس میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک طرف ایک تعلیم یافتہ ہندو بزرگ تشریف فرما تھے۔ پوچھنے لگے "آپ کانگریسی ہیں یا لیگی"؟ میں نے عرض کیا "نہ کانگریسی ہوں نہ لیگی"۔

فرمایا:

"تو کیا آپ مسلمان نہیں ہیں۔"؟

دیکھیے جب ان کی حیاتِ اجتماعی کے بارے میں ایک اہم ترین انقلابی فیصلہ ہونے والا تھا اور یہ فیصلہ کرنے والے بھی اصلاً خود وہی تھے۔ دوسری طرف اس فیصلے کے سلسلے میں ان کے اس عمومی انداز فکر کو دیکھیے، اور یہ سب کچھ دیکھتے وقت اس بات کو بھی ذہن میں تازہ رکھیے کہ یہ اس ملت کا رویہ تھا جو عین اپنی اصل کے اعتبار سے اسلام کی علمبردار تھی اور جس کے وجود کی پہلی اور آخری غایت صرف یہ تھی کہ وہ خود بھی اپنی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی اس دین حق کے سانچے میں ڈھالے رکھے، اور پھر باقی ساری دنیا کے لیے بھی اس دین کی داعی اور اس حق کی شاہد بنی رہے۔

صورتِ واقعہ کے اس پورے جائزے سے جو حقیقت ابھر کر سامنے آئے گی وہ یقینی طور پر اس کے سوا اور کچھ نہ ہوگی کہ اس ملک کی ملت اسلامیہ کا یہ کردار اس کے مقصد وجود سے کوئی مطابقت نہیں رکھتا تھا، اور اس اہم موقع پر اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلے کرتے وقت وہ اپنے منصب و مقام کا کوئی لحاظ نہیں کر رہی تھی۔ حالانکہ یہ ایک ایسا وقت تھا جب اس کے لیے اپنے حقیقی موقف کی طرف پلٹ آنے کے سوا اور کچھ سوچنے کی گنجایش ہی نہیں رہ گئی تھی۔ اگر اب تک اس نے اپنے کو معذور سمجھ رکھا تھا تو ممکن ہے ایک غیر قوم کی غلام اور محکوم ہونے کے باعث اسے ایسا سمجھنے کا حق رہا بھی ہو، وہ کہہ سکتی تھی کہ میری اپنی اجتماعی زندگی کی باگیں تو دوسروں کے ہاتھوں میں ہیں، پھر میں اسے اپنے ایمان کے تقاضوں کے مطابق کیسے ڈھال سکتی ہوں ——— لیکن اب تو یہ مجبوری اور معذوری بھی ختم ہونے والی تھی، اب اس کے سامنے سوال یہ نہیں رہ گیا تھا کہ ایک غاصب اور قاہر سامراج کے جوئے تلے وہ اپنی پسند اور ناپسند کی بات چھیڑ بھی سکتی ہے یا نہیں، بلکہ یہ آچکا تھا کہ اب، جب کہ اس کی یہ محکومانہ بے بسی صرف کچھ دنوں کی بات رہ گئی ہے اور اس کا اجتماعی نظام زندگی خود اس کے اپنے ہاتھوں میں آجانے والا ہے، تو وہ اسے کن بنیادوں پر قائم کرے؟ ایسی حالت میں اور ایسے موقع پر بھی اگر اسے ہوش نہیں آرہا تھا، اور آزادیٔ وطن یا آزادیٔ قوم کی پُر شور جذباتی فضا میں اپنے آپ کو اس طرح کھوئے ہوئے تھی تو کوئی شبہ نہیں کہ یہ ایک زبردست المیہ ہی نہیں تھا، بلکہ اس کے ایمانی احساس کے لیے ایک زبردست تازیانہ بھی تھا۔ چنانچہ کتنے ہی دل اس تازیانے سے تڑپ بھی رہے تھے، اور جب انہی میں سے اللہ کے ایک بندے نے آگے بڑھ کر ادائے فرض کی خاطر ایک منظم جدوجہد کا اعلان کیا تو اس طرح کے بہت سے لوگ اس کی طرف لپک پڑے۔ اس طرح ملک وملت کے وہی حالات، جو عام لوگوں کو وطن

پرستی یا قوم پرستی کے نشے میں سرشار کیے ہوئے تھے، اللہ کے دین کی اقامت کے لیے ایک تحریک کے قیام کا ایک بڑا محرک بن گئے۔

اس سلسلے میں تحریک کے داعیٔ اوّل نے حالات کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے اور عام مسلم قیادت پر مدلل تنقید کرتے ہوئے مسلمانوں کو ان کا صحیح موقف جس طرح بار بار یاد دلایا اور انھیں پوری شدت سے جھنجوڑا تھا، اس کا ایک حوالہ ملاحظہ ہو:

''تمام مسلمانوں کو جان لینا چاہیے کہ بحیثیت ایک مسلم جماعت ہونے کے ہمارا تعلق اس تحریک سے ہے جس کے لیڈر انبیاء علیہم السلام تھے۔ ہر تحریک کا ایک خاص نظام فکر اور ایک خاص طریقۂ کار ہوتا ہے۔ اسلام کا طریق کار اور طریق فکر وہ ہے جو ہم کو انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں میں ملتا ہے۔ ہم خواہ کسی ملک اور کسی زمانے میں ہوں اور ہمارے گردو پیش زندگی کے مسائل و معاملات خواہ کسی نوعیت کے ہوں، ہمارے لیے نصب العین وہی ہے جو انبیاء علیہم السلام کا تھا، اور اس منزل تک پہنچنے کا راستہ وہی ہے جس پر انبیاءؑ ہر زمانے میں چلتے رہے۔ اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ هَدَی اللّٰهُ فَبِهُدٰهُمُ اقْتَدِهْ۔ ہمیں زندگی کے سارے معاملات کو اسی نظر سے دیکھنا ہے جس سے انھوں نے دیکھا۔ ہمارا معیار قدر وہی ہونا چاہیے جو ان کا تھا اور ہماری اجتماعی پالیسی انہی خطوط پر قائم ہونا چاہیے جن پر انھوں نے قائم کی تھی۔ اس مسلک کو اگر ہم چھوڑ کر کسی دوسرے مسلک کا نظریہ اور طرز عمل اختیار کریں گے تو گمراہ ہو جائیں گے۔ یہ بات ہمارے مرتبے سے بہت فروتر ہے کہ ہم اس تنگ زاویے سے معاملات دنیا پر نگاہ ڈالیں جس سے ایک قوم پرست یا وطن پرست یا ایک جمہوریت پسند یا ایک اشتراکی ان کو دیکھتا ہے... الخ'' (ترجمان القرآن۔ جلد: ۱۶۔ عدد ۳، ۴)

ایک اور اقتباس پر نظر ڈالیے، جو اس بات کی وضاحت کرتا ہے کہ صورت حال کی سنگینی اور زعمائے ملت کی گراں گوشی نے صحیح اسلامی مقاصد پر کام کرنے والی ایک تنظیم کے قیام کو کتنا ضروری بنا دیا تھا:

''.......... یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جو ہندوستانی مسلمانوں کے لیے قسمت کے فیصلے کا آخری وقت ہے۔ دل کی آنکھوں نے صاف دیکھ لیا کہ اب اگر اس قوم نے کوئی غلط قدم اٹھایا تو سیدھی ہلاکت کے گڑھے کی طرف جائے گی۔ اور اس کے ساتھ چشم دل ہی نہیں، چشم سر نے بھی یہ دیکھا کہ جن کی تدبیر اور تدبر پر اس قوم کے

مستقبل کا انحصار ہے وہ بھی اب حالات کو اس فراست کے ساتھ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہے ہیں جسے فراست مومن کہا گیا ہے اور اسی کوتاہی کی بنا پر ایسے نازک وقت میں مسلمانوں کو ان مختلف راستوں پر چلائے جا رہے ہیں جن میں سے کوئی بھی منزل نجات کی طرف نہیں جاتا۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ضمیر نے آواز دی کہ یہ وقت خاموش بیٹھنے کا نہیں ہے۔ اب دین وملت کی سب سے بڑی خدمت یہی ہے کہ مسلمانوں کو، ان کے عوام وخواص، علماء وزعماء سب کو، ان حقیقی خطرات کی طرف توجہ دلائی جائے جو مسلم قوم ہونے کی حیثیت سے ہمیں درپیش ہیں، اور اس کے ساتھ انہیں یہ بھی یاد دلایا جائے کہ تمہارے لیے ہدایت کا اصل سرچشمہ خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سیرت پاک میں ہے، جس کو چھوڑ کر محض اپنی تدبیر پر اعتماد کر لینا ہلاکت کا پیش خیمہ ثابت ہوگا۔"

(۲) دوسرے یعنی وطنی نوعیت کے ہنگامی محرک کا سرچشمہ بھی ملک کے وہی حالات اور مسائل تھے جن کی تفصیل ابھی گزر چکی۔ جس وقت یہاں کی تحریک آزادی اپنی منزل مقصود پر پہنچ رہی تھی، اور فطری طور پر یہ سوال سامنے آ گیا تھا کہ آیندہ اس ملک کا نظام کیا ہونا چاہیے اس وقت وطن عزیز کے ہر صاحب فہم اور صاحب بصیرت فرد کا یہ حق ہی نہیں فرض بھی تھا کہ اس اہم ترین سوال پر غور کرے، اور وطن کی ہمہ جہتی فلاح وتعمیر کے لیے اسے جو بہتر اور کامیاب نظام حیات نظر آئے اسے دلائل کے ساتھ اہل ملک کے سامنے پیش کرے اور انھیں اپنا ہم نوا بنانے کی جدوجہد کرے۔ کیونکہ یہ جہاں سارے اہل وطن کے مستقبل کا مسئلہ تھا، وہاں فی الواقع سب سے پہلے خود اس کے اپنے اور اس کی اپنی آیندہ نسل کے مستقبل کا بھی مسئلہ تھا۔ اس لیے اگر کوئی فرد یا گروہ یہ یقین رکھتے ہوئے بھی کہ زندگی کا فلاں نظام وطن عزیز کے لیے سب سے زیادہ اچھا نظام ہے، اپنی زبان بند رکھتا تو یقیناً وہ ملک ہی نہیں خود اپنی ذات کی بھی بدخواہی کا ثبوت دیتا۔ ملک سے محبت، وطن کی بہی خواہی اور فرض شناسی وعاقبت اندیشی کا تقاضا یہی تھا کہ غور وتحقیق کے بعد جسے زندگی کا جو مسلک بھی صحیح تر معلوم ہو رہا ہو اس کے مطابق ملک کی تعمیر نو کا عزم لے کر آگے بڑھے۔ چنانچہ اس غور وتحقیق کے سلسلے میں فرض شناس اور حوصلہ مند لوگوں نے دنیا کے کن کن گوشوں تک اپنی نگاہیں نہیں دوڑائیں۔ یہ نگاہیں مغرب کی سیکولر جمہوریت تک بھی گئیں، روس کی اشتراکیت تک بھی پہنچیں، جرمنی کی نازیت کی طرف بھی لپکیں اور ہندوستان کے قدیم نظام تہذیب پر بھی جا کر ٹکیں۔ ان نگاہوں کو آپ بھٹکی ہوئی نگاہ تو کہہ سکتے ہیں، لیکن اِن پر خیانت اور وطن دشمنی کا

الزام ہرگز نہیں لگا سکتے۔ یہ تو ہر شخص کے اپنے ضمیر اور ایمان کی آواز تھی، جس پر اس نے پورے اخلاص کے ساتھ لبیک کہا تھا۔ کھلا ہوا ظلم ہوگا اگر کسی کے بارے میں کہا جائے کہ وہ اپنے اختیار کیے ہوئے مسلک کے بارے میں مخلص نہ تھا، اور جس نظام اجتماعی کو وہ ملک کی آیندہ تعمیر کے لیے پیش کر رہا تھا، اس کے پیش کرنے میں اس کی نظر وطن کے بہترین مفادات پر نہیں تھی۔

مسلمان بھی اس ملک کی ایک اہم اکائی تھے۔ اس لیے دوسروں کی طرح ان کا بھی فرض تھا کہ وقت کے اس اہم ترین مسئلے پر اپنی توجہات کو مرکوز کر دیتے اور وطن کی تعمیر نو کے لیے، جو فی الواقع خود ان کے اپنے ہی مستقبل کی تعمیر نو تھی، سراپا غور و فکر بن جاتے، اور بھر پورے اعتماد کے ساتھ اس نظام زندگی کو اہل ملک کے سامنے رکھتے جو ان کے نزدیک سب سے اچھا اور کامیاب نظام ہوتا۔ اس کے حق میں دلائل دیتے، رائے عامہ کو ہموار کرتے، اور اسے ملک کا آیندہ نظام بنانے کے لیے جدوجہد میں مصروف ہو جاتے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو یہ ملک کے حق میں خیانت ہوتی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ وطن کی محبت سے ان کا سینہ خالی ہے، یہ اس حقیقت کا اظہار ہوتا کہ جس نظام کو وہ انسانیت کے لیے رحمت و سعادت سمجھتے ہیں اس کی برکتوں سے خود اپنے ہی وطن کو ناآشنا رکھنا چاہتے ہیں، اور اسے ان نظاموں کی نذر ہوتے دیکھ کر مجرمانہ خاموشی اختیار کیے ہوئے ہیں جن کے اندر، ان کے اپنے علم و یقین کی رو سے، انسانیت کے لیے بے شمار ہلاکتیں پوشیدہ ہیں۔ اس سلسلے میں جہاں اس بات کا افسوس ہے کہ مسلمانوں کی بہت بڑی اکثریت نے حالات کے دباؤ کی وجہ سے یا کسی اور امر کے باعث سچی وطن دوستی کے اپنے اس فرض کو عملاً محسوس نہیں کیا، وہیں یہ خوشی اور اطمینان کی بات بھی ہے کہ ان کے اندر ایسے ''اولی بقیہ'' بالکل ناپید نہیں رہے جو ادائے فرض کے لیے آگے بڑھتے۔ چنانچہ ایک گروہ ایسا پایا گیا جس نے احساس فرض کا پورا ثبوت دیا اور ماحول کی تمام تر ناسازگاریوں کے باوجود اس نے اپنی پوری قوت سے یہ آواز بلند کی کہ وطن کی حقیقی فلاح و ترقی صرف اس بات میں ہے کہ یہاں اسلامی نظام قائم کیا جائے اور اس طرح وطن کی محبت اور تعمیر کا یہ جذبہ بھی تحریک اسلامی کے قیام کا ایک اور محرک بن گیا۔ چنانچہ تحریک کے آغاز کے وقت اس امر کے بارے میں بھی پوری وضاحت کر دی گئی تھی:

> ''ظاہر ہے کہ جب کوئی شخص یا گروہ کسی مسلک کا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ کر کے اس امر کا اطمینان حاصل کر لیتا ہے کہ اس میں انسانیت کی فلاح اور انسانی تعلقات و معاملات

کی بہتری کمال درجے پر موجود ہے تو اس کے اندر فطری طور پر یہ خواہش پیدا ہوتی ہے کہ جس اجتماعی زندگی سے خود اس کا تعلق ہے، جس سوسائٹی کے ساتھ اس کی زندگی و موت وابستہ ہے، جس حصۂ انسانیت کے ساتھ وہ تمدنی، سیاسی اور معاشی تعلقات میں جکڑا ہوا ہے، سب سے پہلے اسی کے نظامِ حیات کو اس مسلک کے مطابق بنانے کی کوشش کرے۔ اسے اپنے اس پسندیدہ مسلک کے صحیح و مفید ہونے کا جتنا زیادہ یقین ہوگا اور اس کے دل میں حُبِ انسانیت یا حُبِّ وطن کا جذبہ جتنا زیادہ قوی ہوگا، اتنا ہی زیادہ وہ اپنے ابنائے نوع یا ابنائے وطن کو اس مسلک حق کے فوائد سے بہرہ مند کرنے کے لیے بے چین ہوگا، جس میں وہ ان کی فلاح و بہبود اور کامرانی و خوش حالی مضمر دیکھتا ہے، اور اتنا ہی زیادہ شدت کے ساتھ وہ ان مسلکوں کی حکمرانی کا مخالف ہوگا جن کو وہ پورے یقین کے ساتھ غلط اور نقصان دہ سمجھتا ہے۔ یہ عین انسانی فطرت کا مقتضا ہے، اور اس میں کوئی بات خلافِ حبِّ وطن (Unpatriotc) نہیں ہے۔ بلکہ خلاف حُبِّ وطن تو یہ ہے کہ آدمی جس مسلک کو ایمانداری کے ساتھ موجب فلاح سمجھتا ہو اس کو خاموشی کے ساتھ اپنے دل میں یا اپنے گھر میں لیے بیٹھا رہے، اور جن طریقوں کو وہ ایمانداری کے ساتھ نقصان رساں سمجھتا ہے انھیں اپنے ابنائے وطن کی زندگی پر مسلط ہونے دے۔

جن لوگوں نے مغرب کے جمہوری نظام کا مطالعہ کیا اور اسے اپنے نزدیک برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کے نظامِ تمدن کو مغربی ڈیموکریسی کے نمونے پر ڈھال لیں۔ جن لوگوں نے سوشلزم کا مطالعہ کیا اور اسے برحق پایا وہ آج کوشش کر رہے ہیں کہ ہندوستان کی اجتماعی تعمیر نو (Social Reconstruction) مارکسی اشتراکیت کے طریقے پر ہو۔ یہ آخر کیوں ہے؟ کیا اس کے لیے کوئی حجت اس کے سوا پیش کی جاسکتی ہے کہ ان کے ایمان و اعتقاد کا مقتضا یہی ہے؟ کیا ان کے اس اقدام کو کوئی شخص خلاف حبِّ وطن یا خلافِ حُبِّ انسانیت کہہ سکتا ہے؟ کیا ان کے حق میں یہ راست بازی ہوگی کہ وہ جس مسلک کو اپنے ابنائے جنس کے لیے سعادت و فلاح کا ذریعہ سمجھتے ہیں اس کو رائج کرنے کی جدوجہد نہ کریں اور کسی ایسے نظامِ زندگی کی حکمرانی کو گوارا کرلیں جو ان کے نزدیک باشندگانِ ملک کو پستی اور بدحالی کی طرف لے جانے والا ہو؟ .... بالکل یہی پوزیشن ہماری بھی ہے۔ ہم کو جو چیز ''دارالاسلام'' کی صدا بلند کرنے پر مجبور کر رہی ہے وہ بعینہ وہی ہے جو دوسرے لوگوں کو

''جمہوریت'' اور ''اشتراکیت'' کے نعرے بلند کرنے پر مجبور کررہی ہے.............
اس تمام مطالعہ اور تحقیق وتنقید نے ہمیں اس امر پر پوری طرح مطمئن کردیا کہ انسان کے لیے حقیقی فلاح وسعادت اگر کسی مسلک میں ہے تو وہ صرف اسلام ہے۔ اس کے مقابلے میں ہر مسلک ناقص ہے...... کسی دوسرے مسلک میں انسان کی شخصیت کے ارتقاء (Development of personality) کا پورا موقع نہیں............ یہ اطمینان اور یقین حاصل ہوجانے کے بعد ہمارے لیے راست بازی کا تقاضا کیا ہے؟ کیا بالکل وہی نہیں جو ہمارے جمہوریت پسند یا اشتراکیت پسند ابنائے جنس کے لیے ہے؟ جس مسلک اجتماعی کو ہم پوری دیانت کے ساتھ انسانیت کے لیے رحمت سمجھتے ہیں کیا ہم پر یہ فرض عائد نہیں ہوجاتا کہ اپنے ملک اور اپنے ابنائے نوع کی اجتماعی زندگی کو اسی مسلک کے مطابق منظم کرنے کی جدوجہد کریں؟ جو چیز جمہوریت پسندوں اور اشتراکیت پسندوں کے لیے حق ہے وہ ہمارے لیے کیوں غیر حق ہے؟

(مسلمان اور موجودہ سیاسی کش مکش حصہ سوم ص:۱۳۰-۱۵)

(۳) تیسرا ہنگامی محرک، جو عالمی صورت حال کی پیداوار ہے، اس سے مراد دنیا کا وہ اخلاقی بحران ہے جو رفتہ رفتہ اب حدِّ کمال کو پہنچ چکا ہے۔ چنانچہ ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ رہی ہے کہ انسانی زندگی کے گوشے گوشے میں فساد پھوٹ پڑا ہے، عظیم اخلاقی قدریں پامال ہوتی جارہی ہیں، مادہ پرستی، خودغرضی، نفسانیت، سماجی ناانصافی اور سیاسی شیطنت کا ہر طرف طوفان امنڈا ہوا ہے، اگر ایک طرف انسان کا مادی عروج ستاروں پر کمندیں ڈال رہا ہے تو دوسری طرف اس کی پستی حد سے گزرتی جارہی ہے، اس کے پاس اگرچہ دولت کا انبار ہے، مگر اس کی انسانیت نیلام ہورہی ہے۔ اپنی علمی ترقیوں کے ذریعہ اس نے ہر طرف اجالا پھیلا دیا ہے، مگر اس کے باطن پر جہل کی تاریکی اور گہری ہوتی جارہی ہے۔ وہ اپنی زندگی کے لیے ''تجربات'' اور ''سائنٹفک تحقیقات'' کی روشنی میں اپنے نزدیک 'بہتر سے بہتر' قوانین وضع کرتا رہتا ہے، مگر معاشرہ ہے کہ روز بروز اور زیادہ الجھنوں اور پیچیدگیوں کا شکار ہوتا چلا جارہا ہے۔ بین الاقوامی تعلقات میں مصالحت پسندی اور خوش گواری پیدا کرنے کے لیے بڑے بڑے خوش نما اصول بنائے جاتے رہتے ہیں، مگر ان کا حاصل قوموں کے مابین مزید بے اعتمادی، خوف اور کشیدگی کے سوا اور کچھ نہیں نکل رہا ہے۔ یہ پوری صورت حال بدیہی طور پر اس حقیقت کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ وہ

تہذیب انتہائی فاسد اور زہریلی تہذیب ہے جس کے یہ سب کچھ برگ و بار ہیں، اور جس نے ایک طویل مدت سے عالم انسانی پر مسلط رہ کر اب اسے ان ہولناک تباہیوں کے کنارے تک پہنچادیا ہے۔ پھر یہ اس بات کا اعلان بھی ہے کہ یہ تہذیب اپنی زندگی کی مہلت پوری کر چکی ہے۔ اور اس کے دیے ہوئے زخموں سے لہولہان انسانیت کے لیے نجات کی کوئی نہ کوئی راہ کھلنے ہی والی ہے۔ یہ راہ کونسی ہوگی اور اس جانے والی تہذیب کی جگہ دوسری کون سی تہذیب آئے گی؟ اس سوال کا جواب نہیں معلوم کہ مستقبل میں کیا ملے گا۔ لیکن جہاں تک ذمہ داری کا تعلق ہے، کوئی شک نہیں کہ اس کا جواب دینے کی اولین ذمہ داری جس گروہ پر عائد ہوتی ہے وہ امت مسلمہ کا گروہ ہے۔ کیونکہ یہی وہ گروہ ہے جو صرف اپنے ایمان کی بنا پر نہیں، بلکہ تاریخ کی شہادت کی رو سے بھی دنیا کی سب سے بہتر اور کامیاب تہذیب کا علم بردار اور امین ہے۔ چنانچہ اس تہذیب نے صدیوں تک انسانیت کی کامیاب ترین رہنمائی کی ہے، اور جب اس منصب و مقام سے ہٹی ہے تو اس لیے نہیں ہٹی ہے کہ اس کے اندر زندگی کی توانائی یا مزید رہنمائی کی صلاحیت ہی نہیں رہ گئی تھی، بلکہ اس لیے ہٹی ہے کہ دنیا اس کی پیروی کی ہمت چھوڑ بیٹھی تھی۔ ورنہ وہ اپنے اصولوں کی فطری صداقت، جوہری آفاقیت، عادلانہ حیثیت اور تاریخی عظمت کی بنا پر ہر زمانے کی تمدنی ضرورتوں اور عملی تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اتنی ہی تازہ دم ثابت ہوگی جتنی کہ ماضی میں ثابت ہو چکی ہے۔ اگر ملت اسلامیہ اپنے تشخص اور اپنی حیثیت کا کچھ بھی شعور رکھتی ہے تو اسے اپنی تہذیب کی اس کامل صالحیت اور دائمی صلاحیت کا بھی شعور لازماً ہونا چاہیے، جس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ تہذیبی عزل و نصب کے اس مغتنم موقع پر یہ ملت عمل کے میدان میں لازماً اتر آئے، اور خود اپنی بھی اور پھر دوسروں کی بھی زندگی کو اسلامی تہذیب کے زیر سایہ لانے کی جدوجہد میں مصروف ہو جائے۔ ورنہ اس وقت بھی، جب کہ دنیا موجودہ تہذیب سے بیزار ہو کر کسی ایسی تہذیب کی راہ تک رہی ہے جو اس کے دکھوں کا مداوا بن سکے، اس کا بدستور خاموش ہی رہنا، گویا اپنے اور اپنی تہذیب کے خلاف ناکارہ ہونے کا قطعی فیصلہ دے دینا ہے۔ تہذیب حاضر کی موجودہ حالت نزع تو اس کے لیے حیات نو کا ایک ولولہ انگیز پیام ہے، ایسے وقت میں بھی اس کا حرکت میں نہ آنا ہرگز کوئی وجہ جواز نہیں رکھتا۔ اگر وہ اب تک غفلت یا پست ہمتی کی وجہ سے اسلامی تہذیب پر صبر کیے بیٹھی تھی، تو کم از کم اب اس صبر کو بہر حال 'بے صبری' سے بدل جانا

چاہیے۔خوشی کی بات ہے کہ وقت کی یہ پکار بالکل ہی بے اثر نہیں رہی۔ بلکہ امت میں ایک تعداد ایسے لوگوں کی موجود پائی گئی جن کے احساس فرض کو اس زبردست پکار نے اپنی گرفت میں لے لیا اور پھر اسی احساس نے تحریک اسلامی کے لیے ایک محرک کی شکل اختیار کرلی۔ بانی تحریک کے یہ الفاظ دراصل اسی امر واقعی کا اظہار ہیں جو اس نے تحریک کے زمانۂ آغاز میں لکھے تھے۔

''میرے نزدیک یہ ایسا وقت دنیا پر آرہا ہے جب ایک دور ختم ہوتا ہے اور دوسرے دور کی بنیاد پڑتی ہے۔ مغربی تہذیب اور اس کے اصول پر کام کرنے والوں کو جتنا موقع مشیتِ الٰہی کے تحت مل سکتا تھا، بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پورا ہو چکا ہے یا پورا ہونے کے قریب آ لگا ہے۔ اب یہ سارا نظام درہم برہم ہونا شروع ہوگیا ہے، اور ایک دوسرے نظام سے پہلے جو اضطرابی کیفیت لازماً طاری ہوا کرتی ہے اس کا آغاز ہو چکا ہے۔ اگرچہ اقامت دین کی کوشش ہر زمانے میں اہل ایمان پر فرض ہے، مگر خصوصیت کے ساتھ ایسے وقت میں، جب کہ دنیا حاضر الوقت نظاموں سے تلخ تجربات کی بنا پر مایوس ہوتی جارہی ہے اور کسی دوسرے نظام کے قائم ہونے کے لیے زمین ہموار ہورہی ہے، دین حق کے قیام کی کوشش کرنا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ جو مواقع اس وقت پیدا ہو گئے ہیں اگر ان سے فائدہ اٹھانے کی کوشش ہم نے نہ کی تو ہم سے سخت باز پرس ہوگی۔''

نوعیت

تحریک کے پس منظر کی اور اس کے اسباب ومحرکات کی یہ تفصیل اس حقیقت کو بھی واضح کردیتی ہے کہ یہ تحریک اپنی نوعیت کی ایک ہی تحریک ہے، اور اسے معاصر تحریکوں میں سے کسی پر بھی قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ یہ صحیح ہے کہ اس کا آغاز آزادیٔ وطن اور تحفظ ملت کی تحریکوں کے دور شباب میں ہوا تھا، مگر بالکل غلط ہوگا اگر صرف اس بنا پر یہ خیال کرلیا جائے کہ یہ بھی انھی جیسی کوئی تحریک ہے، جو انھی کی طرح حالات زمانہ کی پیداوار تھی اور کسی وقتی اور محدود مقصد کی خاطر وجود میں آئی تھی۔ بلاشبہ یہ حالات زمانہ بھی اس کے قیام کے سلسلے میں اپنی ایک اہمیت رکھتے ہیں اور اس باب میں ان کی اثر اندازی کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن ان کی یہ اہمیت اس سے زیادہ کچھ نہیں تھی کہ انہوں نے اس بارے میں ذہنوں کے لیے ایک زبردست یاددہانی اور تنبیہہ کا کام دیا تھا۔ ورنہ جہاں تک حقیقت واقعی کا تعلق ہے اس دعوت کا سرا حالات زمانہ یا مفادات ملک وملت سے نہیں، بلکہ پیروان اسلام کے مقصد وجود سے جڑا ہوا ہے۔ وہ اصلاً صرف اس لیے شروع کی گئی

ہے کہ ملت اسلامیہ اپنے دائمی فرضِ منصبی سے عہدہ برآ ہو سکے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اگر اس صدی کے وسط کے حالات وہ نہ ہوتے جن میں یہ تحریک شروع کی گئی تھی، تو بھی وہ شروع ہوتی، یا کم از کم اسے لازماً شروع ہونا چاہیے تھا۔ کیونکہ وہ ایک دوامی فریضے کی انجام دہی تھی، جو نہ کسی وقت کے ساتھ مقید ہے اور نہ کسی جگہ کے ساتھ۔ 'مسلمان' جہاں، جس زمانے میں اور جن حالات میں بھی پایا جائے گا، وہاں انسانی زندگی کو دوسرے سارے افکار و نظریات اور مقاصد کی ڈگر سے ہٹا کر خالص اسلامی بنیادوں پر تعمیر کرنے کی حکیمانہ جدوجہد بھی ضرور پائی جائے گی۔ ورنہ اس کا وجود ہی یکسر بے معنی ہو کر رہ جائے گا، وہ اپنے مشن سے بے پروا اور اپنے فرض کا تارک ٹھہرے گا، اور انجام کار خود بھی دونوں جہان کے خطرات کی زد میں رہے گا، اور دوسروں کو بھی دنیا کی سچی فلاح اور آخرت کی نجات سے محروم رکھنے کا یک گونہ مجرم قرار پائے گا۔ اس لیے اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ یہ تحریک ملک اور ملت کی دوسری تمام تحریکوں سے اصول و مقاصد ہی کے لحاظ سے نہیں اپنی اصل اور اپنی حیثیت کے اعتبار سے بھی بالکل مختلف تحریک ہے۔ اَصْلُھَا ثَابِتٌ وَّ فَرْعُھَا فِی السَّمآءِ۔

بڑی بے بصیرتی ہوگی اگر ان معروضات کی بنا پر یہ گمان کر لیا جائے کہ پھر تو اس تحریک کو آزادئ وطن اور تحفظ ملت کے ان مقاصد سے کوئی دل چسپی نہ رہی ہوگی جن کے لیے دوسری تحریکیں جدوجہد کر رہی تھیں، جس تحریک کے سامنے مقصد اتنا عظیم، وسیع اور ہمہ گیر رہا ہو کہ تمام ناقص اور فاسد نظاموں سے ملک کو یکسر محفوظ رکھ کر یہاں خدائی ہدایات پر مبنی کامل و مکمل نظام عدل قائم کیا جائے، آخر اس سے زیادہ دوسری کون سی تحریک وطن کی آزادی اور ملت کے تحفظ کی خواہشمند اور اس کا ذریعہ بن سکتی تھی؟ یہ 'آزادی' اور یہ 'تحفظ' تو اس کے مقاصد میں آپ سے آپ شامل تھے۔ البتہ یہ 'آزادی' وہ آزادی نہیں تھی جو دوسروں کا مطمح نظر بنی ہوئی تھی، اور نہ یہ 'تحفظ' وہ تحفظ تھا جسے تحفظ سمجھا جا رہا تھا، بلکہ اس سے بنیادی طور پر مختلف تھا۔ ان دونوں کے درمیان وہی فرق تھا جو آسمان کی بلندی اور زمین کی پستی میں ہے، اور اسی لیے ان مقاصد کے حصول کے لیے اس تحریک کے طریقے بھی وہ نہیں تھے جنہیں دوسروں نے اختیار کر رکھا تھا۔ دوسری تحریکوں کی مطلوبہ آزادی تو صرف یہ تھی کہ اس ملک پر سے ایک غیر قوم کی حکومت ختم ہو جائے اور اس کا اقتدار اعلیٰ اس کے باشندوں کی طرف منتقل ہو، لیکن تحریک اسلامی کے نزدیک

مطلوبہ آزادی یہ تھی کہ یہاں کے لوگوں کو سرے سے انسانی حکومت ہی سے نجات مل جائے اور اقتدار اعلیٰ اس حاکم مطلق کا تسلیم کرلیا جائے جس کے سوانی الواقع کوئی صاحب اقتدار ہی نہیں ہے، اور جس کی اطاعت گزاری ہی انسان کا سب سے بڑا شرف اور اس کی حقیقی آزادی ہے، اس کا نشانہ صرف انگریز کی حاکمیت کا خاتمہ نہیں، بلکہ ہر انسانی حاکمیت کا خاتمہ تھا۔ اس کی نظر میں اگر برطانوی حکومت 'سامراج' تھی تو ہندوستانیوں کی اپنی حکومت بھی 'سوراج' نہیں تھی۔ غرض اس کے نزدیک انسانی اقتدار اور انسانی حاکمیت ہی اصل غلامی تھی، خواہ وہ کسی کی بھی ہو اور اصل آزادی صرف یہ تھی کہ ہر انسانی حاکمیت ہی اصل غلامی تھی، خواہ وہ کسی کی بھی ہو، اور اصل آزادی صرف یہ تھی کہ ہر انسانی اقتدار اور ہر انسانی حاکمیت کی بیڑیاں کٹ جائیں اور خدا کے بندے اپنے فرماں روائے حقیقی کے تابع بن کر اپنی پوری زندگی اس کی فلاح بخش ہدایتوں کے مطابق بسر کرنے کے لیے آزاد ہو جائیں۔ اسی طرح اوروں کے خیال میں ملت کا مطلوبہ تحفظ صرف یہ تھا کہ اپنے مستقبل کی تعمیر کرنے اور اپنی زندگی کا نظام چلانے میں مسلمان قوم، بالکل آزاد اور خود مختار ہو اور کوئی دوسری طاقت آڑے نہ آسکے۔ لیکن تحریک اسلامی کے نزدیک ملت کا مطلوبہ تحفظ یہ تھا کہ اپنا مستقبل تعمیر کرنے اور اپنی زندگی کا نظام چلانے میں مسلمان آزاد و خود مختار تو ہوں، مگر بالکل آزاد و خود مختار ہرگز نہ ہوں، اور اس معاملے میں نہ صرف یہ کہ کوئی دوسری طاقت آڑے نہ آسکے، بلکہ وہ خود بھی آڑے نہ آسکیں۔ یعنی ان کے سامنے نہ اپنی رائیں ہوں، نہ اپنی خواہشیں، نہ اپنے مادی مفادات ہوں اور نہ اپنے قومی جذبات ، دولفظوں میں یہ کہ وہ خود نہ ہوں، بلکہ صرف اسلام ہو۔ اسی کے مفاد پر ان کی نگاہیں مرکوز ہوں، اور اسی کو اپنی اور باقی دنیا کی زندگی کا نظام بنانے کے لیے ان کی دلچسپیاں، ان کی آرزوئیں، ان کے جذبات اور ان کی سرگرمیاں وقف ہوں۔ کیونکہ ملت اسلامیہ جس ملت کا نام ہے، اس کا حقیقی تحفظ دراصل اسلام ہی کے تحفظ کا پرتو ہوتا ہے، اور اسے جو تحفظ اسلام کے تحفظ کے نتیجے میں حاصل نہیں ہوتا وہ اس کا تحفظ نہیں، بلکہ فی الواقع عدم تحفظ ہوتا ہے۔

یہ ہیں وہ مخصوص حقائق جن کے ساتھ تحریک اسلامی نے اپنے سفر کا آغاز کیا ہے۔ ضروری ہے کہ اس کے بارے میں کچھ اور معلوم کرنے سے پہلے ان اہم اور بنیادی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشیں کرلیا جائے۔

نصب العین

اصولی اور دستوری تعبیر

تحریک اسلامی کا مقصد اور نصب العین 'اقامت دین' ہے یعنی ایک ایسے جامع اور ہمہ گیر نظام زندگی کا قیام جو اپنے تصور حیات، اپنے اصول، اپنے مقاصد اور اپنے تفصیلی قوانین، ہر چیز میں تمام تر اللہ رب العالمین کے احکام و ہدایات پر مشتمل ہو۔ اس کے دستور میں یہ نصب العین ان لفظوں میں بیان کیا گیا ہے۔

"جماعت اسلامی ہند کا نصب العین اقامت دین ہے، جس کا محرک صرف رضائے الٰہی اور فلاحِ آخرت کا حصول ہے۔" (ص:۷)

چونکہ کسی تحریک کے اندر اس کے نصب العین کی حیثیت وہی ہوا کرتی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے، وہی اس کے اصولوں کا، اس کے طریق کار کا، اس کے افکار و تصورات کا اور اس کے مزاج کا سرچشمہ ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اسے سمجھنے کے لیے سب سے بنیادی ضرورت یہ ہوتی ہے کہ پہلے اس کے نصب العین کو پوری وضاحت سے اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔ جہاں تک تحریک اسلامی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں بھی یہ بات نہ صرف یہ کہ ناگزیر ہے، بلکہ غیر معمولی حد تک ناگزیر ہے۔ کیونکہ اس کا نصب العین اپنی نوعیت کا واحد نصب العین ہے، اور اس نصب العین کی تعبیر کا تعلق لازمی طور پر چند ایسی مخصوص اصطلاحات سے ہے، جن کے صحیح اور پورے مفہوم سے آج کا ذہن بالعموم ناواقف بھی ہے اور نامانوس بھی۔ اس لیے اس تحریک کے بارے میں دوسری تمام تفصیلات معلوم کرنے سے پہلے قطعی ضروری ہے کہ اس کا نصب العین اچھی طرح روشنی میں آ جائے۔ تاکہ نہ صرف اسے اپنی صحیح شکل میں دیکھ لیا جائے، بلکہ پوری تحریک سے صحیح واقفیت کی شاہ کلید بھی ہاتھ آ جائے۔

وضاحت طلب اُمور

نصب العین کی اس مجمل دستوری تعبیر کے وہ اہم امور اور فیصلہ کن نکات، جن کی وضاحت ضروری ہے اور جنھیں تحریک کا صحیح تعارف حاصل کرنے کے لیے لازماً ذہن نشیں رکھنا چاہیے، حسب ذیل ہیں:

(ا) دین سے مراد صرف دین اسلام

اس تعبیر میں، دین، کا لفظ بظاہر عام ہے اور وہ کسی خاص دین کے لیے استعمال نہیں کیا گیا ہے، مگر امر واقعی یہ نہیں ہے اور معناً اس کے اندر تخصیص و تعیین قطعاً موجود ہے۔ یعنی اس سے متعین طور پر ایک خاص دین ـــــ دینِ اسلام ـــــ ہی مراد ہے، کوئی اور دین، یا دین کا کوئی عام اور غیر متعین مفہوم ہرگز مراد نہیں ہے۔ چنانچہ پچھلی بحث کے اندر اس تخصیص کی واضح بنیاد اور ناقابل انکار دلیل صاف موجود دیکھی جا سکتی ہے جس میں تفصیل سے بتایا جاچکا ہے کہ اگرچہ ہر وہ ہدایت نامہ جو کسی بھی دور میں اور کسی بھی قوم یا ملک کے اندر اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوا تھا، دین حق ہی تھا، اور لازمی اتباع ہی کے لیے نازل ہوا تھا، لیکن اس کے باوجود خود اللہ رب العالمین ہی کے قطعی فیصلے اور واضح اعلان کی بنا پر پوری دنیا میں اب اس کا آخری دین، اسلام ہی وہ تنہا دین ہے جسے اس کی منظوری کی سند حاصل ہے، جس کا اتباع ہر ایک کے لیے ضروری ہے اور جس کی پیروی کر کے ہی انسان اپنے اس فریضہ عبادت سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا ہے۔ حقیقت واقعی جب یہ ہے تو 'اقامت دین' سے مراد بالبداہت صرف 'اقامت اسلام' ہی ہوسکتی ہے۔

سوال کیا جاسکتا ہے کہ پھر نصب العین کی تعبیر صاف طریقے پر 'اقامت اسلام' ہی کے لفظوں سے کیوں نہیں کردی گئی، اور اس کے بجائے اقامت دین کی اصطلاح کیوں وضع کی گئی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ 'اسلام' کے پس منظر اور 'دین' کی تاریخی حقیقت کا تقاضا تھا کہ ایسا ہی کیا جائے۔ اس 'پس منظر' اور اس 'حقیقت' کو گزشتہ صفحات میں وضاحت سے بیان کیا جاچکا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اسلام نہ تو کوئی نیا دین ہے نہ کسی دوسرے دین خداوندی کا حریف، بلکہ اسی سلسلۂ ہدایت یا دین حق کی آخری کڑی ہے جو ابتداء سے نازل ہوتا رہا ہے۔ البتہ اسے دوسرے

آسمانی مذاہب کے مقابلے میں چند اہم ترین امتیازات ضرور حاصل ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے آخری ہدایت نامے کی ہے، اس کی نوعیت بین الانسانی ہے، وہ ہر پہلو سے ایک مکمل اور ہمہ گیر نظام حیات ہے، اس کا نزول ساری دنیا کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ہے، اور اب اسی کے اتباع پر آخرت کی نجات اور دنیا کی فلاح موقوف ہے۔ لیکن ان ساری باتوں کے باوجود اپنی اصل کے اعتبار سے، اور اپنی بنیادی تعلیمات اور اپنے مقاصد میں، دوسرے آسمانی مذاہب سے ذرہ برابر بھی مختلف نہیں ہے۔ اس کے معنی واضح طور پر یہ ہوئے کہ اس دین کی اقامت فی الواقع سبھی دینوں کی اقامت ہے اور اس کے ذریعہ ان کے بھی نزول کے مقاصد نہ صرف یہ کہ پورے ہو جاتے ہیں، بلکہ اپنی بہترین شکل میں پورے ہو جاتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ایسی عظیم صداقت اور غیر معمولی حقیقت نفس الامری تھی، جسے نظر انداز کر دینے کے بعد اسلام کی حیثیت سمجھی ہی نہیں جا سکتی۔ اس لیے مناسب ہی نہیں، بلکہ ضروری سمجھا گیا کہ 'اقامت اسلام' کے بجائے 'اقامت دین' کے الفاظ لائے جائیں، تا کہ یہ حقیقت نمایاں ہو جائے کہ تحریک اسلامی کا نصب العین جس دین کی اقامت ہے، وہ دراصل وہی ایک دین حق ہے جو نوع انسانی کے آغاز سے مختلف قوموں، زمانوں اور ملکوں میں مسلسل نازل ہوتا رہا ہے، جس کی بنیادی تعلیمات بھی ہمیشہ ایک سی رہی ہیں اور اصول و مقاصد بھی یکساں رہے ہیں، اور جو اپنے آخری اسٹیج اور اپنی کامل ترین ہیئت کو پہنچ کر 'اسلام' کے نام سے موسوم ہوا ہے۔ یقینی بات ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جاتا اور نصب العین کی دستوری تعبیر میں 'دین' کے بجائے 'اسلام' ہی کا لفظ رکھا گیا ہوتا تو یہ عظیم حقیقت آنکھوں سے اوجھل رہ جاتی، حالانکہ اسے کسی طرح اوجھل نہیں رہنا چاہیے تھا۔ چنانچہ صرف اتنا ہی کافی نہیں سمجھا گیا کہ اسلام کے بجائے 'دین' کا لفظ لایا جائے، بلکہ ساتھ ہی 'تشریح' کے ذریعے اس اہم حقیقت کو ضروری حد تک نمایاں بھی کر دیا گیا ہے جس کے الفاظ یہ ہیں:

> ''اقامتِ دین میں لفظ 'دین' سے مراد وہ دین حق ہے، جسے اللہ رب العالمین اپنے تمام انبیاء کے ذریعے مختلف زمانوں میں اور مختلف ملکوں میں بھیجتا رہا ہے اور جسے آخری اور مکمل صورت میں تمام انسانوں کی ہدایت کے لیے اپنے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے ذریعے نازل فرمایا، اور جو اب دنیا میں ایک ہی مستند، محفوظ اور عنداللہ مقبول دین ہے، اور جس کا نام اسلام ہے۔'' (دستور ص: ۷)

(۲) خالص اصولی نوعیت

یہ نصب العین اپنی نوعیت میں واضح طور پر ایک خالص اصولی اور تصوراتی نصب العین ہے۔اس کے اندر کسی بھی مادی رشتے کے مفاد اور مصالح کو مقصدیت کا مقام حاصل نہیں۔نہ یہ کسی قوم یا نسل کو اپنے سامنے رکھتا ہے نہ کسی رنگ یا زبان کو، نہ اسے کسی طبقے یا گروہ سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ کسی ملک یا سرزمین سے۔ یہ کچھ بنیادی حقائق ،عقائد وتصورات اور زندگی کے ایک خاص طریقے اور نظام کا نام ہے،اس کی نگاہ کلیۃً اور خالصۃً ،انسانی، اخلاقی اور روحانی نگاہ ہے۔اسے انسان سے بحیثیت انسان بحث ہے۔ یہ فی الواقع ، مسلم وغیر مسلم ، امیر وغریب ، کالے، گورے، سرمایہ دار، مزدور اور خوش حال و بدحال، سبھی کے لیے ہے۔سب اس کے مخاطب اور مطلوب ہیں۔ ہر وہ فرد بشر اس کا 'اپنا' ہے جو اللہ احکم الحاکمین کی حاکمیت اور معبودیت کو سچے دل سے تسلیم کرے، اپنے آپ کو اس کے 'دین' اور ہدایت نامے کے سپرد کردے، اور اس کی 'رضا' اور 'آخرت کی فلاح'، کو اپنا حقیقی مطلوب و مقصود بنائے، اور جو ایسا نہ کرے وہ اس کا غیر ہے، خواہ وہ کسی بھی قوم یا سرزمین سے تعلق رکھتا ہو۔اس کا 'حریف' صرف ایک ہے اور وہ ہے خدا سے بغاوت کا رویہ، کوئی بھی فرد یا گروہ نہیں۔اس کا 'عزیز' بھی صرف ایک ہی ہے اور وہ ہے خدا کی بندگی کا طرز عمل، کوئی بھی شخص یا کوئی قوم نہیں۔اس کی ساری دلچسپیاں بس اسی ایک نقطے پر مرکوز ہیں اور اس سے ہٹ کر کسی اور شے کو کوئی اہمیت دے دینے کا سوال اس کے لیے قطعاً خارج از بحث ہے۔

(۳) دین کے مفہوم کی حدیں

انسان کے ذہن میں کچھ تصورات ہوتے ہیں اور خارج میں اس کے کچھ اعمال ہوتے ہیں، جو دراصل انہی تصورات کا مظہر ہوا کرتے ہیں۔انسانی زندگی تمام تر انہی دو چیزوں سے عبارت ہوتی ہے۔اسلام ان دونوں ہی سے بحث کرتا اور ان کے بارے میں ہدایتیں دیتا ہے۔ یہ ہدایتیں ہمہ جہتی اور ہمہ گیر نوعیت کی ہیں، انسان کے ظاہر یا باطن کا کوئی ایک بھی پہلو اور اس کے فکر وعمل کا کوئی ایک بھی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ان ہدایات سے آزاد ہو۔وہ جہاں کائنات کے بارے میں ضروری حقائق سے باخبر کرتا ہے اور خالق کائنات کی ذات وصفات کے بارے میں صحیح

عقائد کی تلقین کرتا ہے، انسان کے اپنے خدا سے تعلق کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کی تعیین کرتا ہے اور اس کی اطاعت، رضا جوئی اور پرستش کے طریقوں کی تعلیم دیتا ہے، اچھے اخلاق کی ہدایت دیتا ہے اور نفس انسانی کا تزکیہ کرتا ہے، وہیں انسان کی خانگی، عائلی، کاروباری، معاشرتی، معاشی، سیاسی، غرض پوری انفرادی و اجتماعی زندگی کے لیے بھی احکام وقوانین دیتا ہے۔ اس طرح عبادت گاہ سے لے کر تمدنی اور اجتماعی معاملات کے دور و دراز گوشوں تک زندگی کے ہر مسئلے کو وہ اپنے دائرے میں لیے ہوئے ہے اور اس کا ہر حکم، چاہے وہ جس معاملے سے بھی متعلق ہو ''دین'' ہی ہے، اور اس کی بجا آوری ضروری اور شرط دینداری ہے۔ دستور میں 'دین' کی تشریح کرتے ہوئے اس کی اس جامعیت کو اس طرح بیان کیا گیا ہے:

> ''یہ دین انسان کے ظاہر و باطن اور اس کی زندگی کے تمام انفرادی و اجتماعی گوشوں کو محیط ہے۔ عقائد، عبادات اور اخلاق سے لے کر معیشت، معاشرت اور سیاست تک انسانی زندگی کا کوئی ایک شعبہ بھی ایسا نہیں ہے جو اس کے دائرے سے خارج ہو۔''
>
> (ص: ۷، ۸)

(۴) اقامت کا مفہوم

اقامت کے لفظی معنی کسی ٹھوس چیز کو بالکل سیدھی کر دینے یا سیدھی کھڑی کر دینے کے ہیں اور جب اس لفظ کا استعمال ایسی چیزوں کے لیے ہوتا ہے جو ٹھوس نہ ہوں تو اس وقت اس کے معنی ہر حیثیت سے درجۂ کمال تک پہنچا دینے کے ہوتے ہیں، جیسا کہ منطقی طور پر ہونا ہی چاہیے تھا۔ کیونکہ کسی ٹھوس چیز کو بالکل سیدھی کھڑی کر دینے کا حاصل یہ ہوتا ہے کہ اس کا پورا وجود اپنے سارے حسن و قبح کے ساتھ بالکل نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس لیے کسی ایسی چیز کو جو ٹھوس نہ ہو، ''کھڑی کر دینے'' کا مفہوم و مدعا اس کے سوا کچھ اور ہو ہی نہیں سکتا کہ اسے اپنی اصل صفات اور اپنے عمل واثر کے لحاظ سے پوری طرح بروئے کار لا دیا جائے۔ اس وضاحت کے پیش نظر دین کی اقامت کے معنی یہی ہو سکتے ہیں، اور یہی ہیں کہ اس کے سارے احکام و مطالبات کو انسانی زندگی میں اس طرح نافذ کر دیا جائے کہ ہر دیکھنے والی آنکھ کو اس کا مکمل سراپا نظر آ جائے۔ چونکہ یہ احکام دین ہمہ گیر نوعیت کے ہیں اور پوری زندگی کو محیط ہیں، جیسا کہ ابھی معلوم ہو چکا، اس لیے 'اقامت دین' کا مفہوم و مدعا واضح طور پر یہ ہوا کہ ہماری یہ زندگی پوری کی پوری ان احکام کے

تحت آ جائے، اور وہ احکام اپنی صحیح شکل میں اپنی حقیقی روح کے ساتھ، ہر طرف جاری و ساری ہو جائیں، اور زندگی کا کوئی شعبہ اور کوئی معاملہ بھی ان کی پیروی کے شرف سے بے بہرہ نہ رہے۔ ذہنوں میں وہی عقائد و نظریات گھرے جمے ہوئے ہوں، جنہیں اس دین نے حق کہا ہے، اللہ کی بندگی اس طرح کی جائے جس کی اس نے تعلیم دی ہے، لوگوں کی سیرت اس سانچے میں ڈھلی ہوئی ہو جو اس نے فراہم کی ہے، ان اخلاقیات کا دور دورہ ہو جن کی اس نے تعیین کی ہے، انسان کی نجی زندگی سے لے کر اس کی معاشرت، اس کے تمدن، اس کی معیشت، اس کی سیاست اور اس کے بین الاقوامی تعلقات تک ہر چیز پر ان قوانین و ضوابط کی عمل داری ہو جن کی اس نے ہدایت دی ہے۔ غرض انسان پوری طرح اس کے رنگ میں رنگ گیا ہو، اور اپنے ہر حال، ہر مقام اور ہر کام میں بس اسی دین کی تابع داری میں منہمک اور اسی کی منشا کی تکمیل کے لیے وقف نظر آتا ہو۔
اس پوری بات کو دستور نے چند لفظوں میں جامعیت کے ساتھ سمیٹ کر اس طرح بیان کیا ہے:

> ''اس دین کی اقامت کا مطلب یہ ہے کہ کسی تفریق و تقسیم کے بغیر اس پوری دین کی مخلصانہ پیروی کی جائے، اور ہر طرف سے یکسو ہو کر کی جائے، اور انسانی زندگی کے انفرادی و اجتماعی تمام گوشوں میں اسے اس طرح جاری و نافذ کیا جائے کہ فرد کا ارتقاء معاشرے کی تعمیر اور ریاست کی تشکیل سب کچھ اسی دین کے مطابق ہو۔'' (ص: ۸)

(۵) غایتِ مقصود

تحریکوں کا ایک نصب العین ہوا کرتا ہے اور ان کی ایک حقیقی غایت ہوتی ہے، جو اس نصب العین کے پس پشت موجود ہوا کرتی ہے۔ ''حقیقی غایت'' سے مراد وہ اصل مقصود ہے جس کی خاطر یہ نصب العین اختیار کیا جاتا ہے۔ نصب العین کو قالب، اور غایت مقصود کو اس کی روح سمجھیے۔ مثال کے طور پر کمیونسٹ تحریک کو لے لیجیے۔ اس تحریک کا نصب العین پرولتاری نظام کا قیام ہے، مگر فی نفسہ یہ نظام اس کی اصل غایت مقصود نہیں ہے، بلکہ یہ ہے ـــ جیسا کہ اس کا دعویٰ ہے ـــ کہ محنت کشوں، مزدوروں اور کسانوں کے ساتھ پورا پورا معاشی انصاف ہو، انہیں ساری ضروریات زندگی فراہم ہوں۔ ان کا استحصال نہ ہونے پائے۔ کمیونزم اگر پرولتاری انقلاب کو اپنا نصب العین قرار دیتا ہے تو صرف اس لیے کہ اس کے خیال میں یہی انقلاب اس غایت مقصود تک پہنچنے کی واحد سبیل ہے اور اسی نظام کے وجود پر اس مقصد کا حصول موقوف ہے۔ غور و فکر کے بعد

آپ دوسری تمام تحریکوں کا معاملہ بھی ایسا ہی پائیں گے اور انہی میں تحریک اسلامی بھی شامل دکھائی دے گی۔ چنانچہ اس کا نصب العین اگر 'اقامت دین' ہے تو اس کی غایت مقصود انسان کی اخروی زندگی کی نجات اور فلاح ہے اور اصل اہمیت قدرتی طور پر، اسی چیز کی ہے، جس کے بغیر اقامت دین کا نصب العین ایک لفظ بے معنی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص بھی اس نصب العین کو اپناتا ہے اسے وہ صرف اس لیے اپناتا ہے، یا کم از کم یہ کہ اسے لازماً صرف اسی لیے اپنانا چاہیے کہ اس کے ذریعے وہ اپنے خدا کی رضا حاصل کر سکے گا، اس کی رحمت و مغفرت سے ہم کنار ہو سکے گا اور اس کی اخروی زندگی کامیاب و بامراد ہو سکے گی۔ اس ایک مقصود، اس ایک مطلوب اور اس ایک مرکز آرزو کے سوا اس کا کوئی اور حقیقی مقصود و مطلوب بالکل نہ ہوگا۔ ظاہر ہے کہ یہ انتہائی غیر معمولی اہمیت کی بات تھی، اور بالکل ضروری تھا کہ اسے ہر وقت نگاہوں میں رکھا جاتا۔ چنانچہ یہی ضرورت اور مصلحت تھی جس کے پیش نظر نصب العین کے دیگر اہم نکتوں کو جہاں تشریح کے ذریعے ذیلی طور پر واضح اور نمایاں کیا گیا ہے، وہاں اس سب سے خاص اور سب سے بنیادی نکتے کو خود نصب العین ہی کی اصولی تعبیر میں شامل رکھا گیا ہے۔

یہ بات کہ ''رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا حصول'' اقامت دین کی جدوجہد پر کیوں موقوف ہے، پچھلی بحثوں میں بخوبی واضح کی جا چکی ہے، جہاں بتایا گیا ہے کہ انسان کا مقصد وجود اگر اللہ کی عبادت ہے تو اس عبادت کی مطلوبہ بجا آوری کی صحیح عملی شکل ہی کا دوسرا نام 'اقامت دین' ہے۔

(۶) دنیوی فلاح بہترین ضمانت

یہ نصب العین اپنی حقیقی غایت کے مدّنظر تمام تر آخرت کی فلاح و سعادت سے متعلق ہونے کے باوجود دنیوی زندگی کی فلاح سے بھی بے تعلق نہیں ہے۔ بلکہ پوری طرح متعلق ہے۔ چنانچہ حقیقت واقعی یہ ہے کہ دنیا میں انسانی معاشرے کو جو امن اور سلامتی، جو سکون اور مسرت، جو خوشحالی اور اقبال مندی اس کے طفیل میسر آتی ہے اس کی نظیر دوسرا کوئی نظام فکر و عمل نہ پیش کر سکا اور نہ پیش کر سکتا ہے۔ اس طرح یہ نصب العین دنیا اور آخرت، دونوں جہاں کی کامرانیوں کا ضامن ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ آخرت کی کامرانی اس کا حقیقی مقصود ہے جب کہ دنیا کی کامرانی اس کا ضمنی فیضان ہے۔ اس بات کا ثبوت کہ 'دین کی اقامت' دنیوی فلاح کی بھی بہترین

ضمانت ہے، تاریخ بھی پیش کر چکی ہے اور اسلام کے بنیادی تصورات اور اس کی تعلیمات میں بھی نمایاں طور پر موجود پایا جاتا ہے۔ ان تصورات میں سے ایک تو انسان کی نوعی حیثیت کے بارے میں اس کا یہ تصور ہے کہ وہ دنیا میں خالق کائنات کا خلیفہ اور نائب اقتدار بنا کر پیدا کیا گیا ہے، دوسرے حیات انسانی کے بارے میں اس کا یہ کہنا ہے کہ اس کی دنیا اور آخرت میں کوئی ٹکراؤ تو درکنار کوئی بے ربطی بھی نہیں ہے، بلکہ یہاں سے لے کر وہاں تک ایک تسلسل ہے اور ایک ہی زندگی ہے جس کے ابتدائی دور کا نام دنیوی زندگی اور آخری دور کا نام اخروی زندگی ہے۔ اس صورت واقعہ کی بنا پر اسلام کی تعلیمات کا بھی حال قدرتی طور پر یہ ہے کہ وہ نہ محدود ہیں اور نہ دنیا سے بے تعلق اور آخرت کے لیے مخصوص، بلکہ دنیوی مسائل و معاملات کو بھی وہ اسی توجہ اور ہمہ گیری کے ساتھ زیر بحث لاتی ہیں اور ایک ایک مسئلے کے بارے میں واضح رہنمائی کرتی ہیں جس طرح کہ آخرت کے معاملے میں کرتی ہیں۔ یہ تعلیمات اتنی متوازن، اتنی عادلانہ اور اتنی حقیقت پسندانہ ہیں کہ ان کے نفاذ کے بعد انسانی زندگی مسائل کی پیچیدگیوں کے عذاب سے پوری طرح مامون ہو جاتی ہے۔ ان سب باتوں کی موجودگی میں اسلام کا دنیوی فلاح وعظمت کی بھی بہترین ضمانت ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہی کہا جا سکے گا۔ دستور نے دین کے اس اہم اور امتیازی وصف کی تشریح (وضاحت) ان مختصر مگر جامع الفاظ میں کی ہے:

> ''یہ دین جس طرح رضائے الٰہی اور فلاح آخرت کا ضامن ہے اسی طرح دنیوی مسائل کے موزوں حل کے لیے بہترین نظام زندگی بھی ہے اور انفرادی و اجتماعی زندگی کی صالح اور ترقی پذیر تعمیر صرف اسی کے قیام سے ممکن ہے۔'' (ص: ۸)

(۷) مطلوبہ معیار

اس نصب العین کا معیار مطلوب دو لفظوں میں یہ ہے کہ پورا انسانی معاشرہ اللہ رب العالمین کے احکام و مرضیات کے رنگ میں رنگ جائے۔ فرد اور جماعت، دونوں حق پسندی، نیک روی اور خدا پرستی کو اپنا شعار بنا لیں۔ فضا خیر و صلاح سے اس طرح معمور ہو جائے کہ اس کے اندر اچھا بننا آسان اور برا بننا مشکل ہو۔ افراد جماعت کے لیے اور جماعت افراد کے لیے حفاظت، طاقت اور ترقی کا ذریعہ ثابت ہوں۔ امیر اور غریب میں اور سرمائے اور محنت میں،

رقابت اور کش مکش کے بجائے تعاون، خیر سگالی اور بہی خواہی کے جذبات کارفرما ہوں۔ قانون تمام تر قرآن وسنت کے نافذ ہوں، کسی شخص یا کسی مجموعہ افراد کی آزاد رایوں اور خواہشوں کا قانون سازی میں مطلق کوئی دخل نہ ہو۔ خدا کے بندے اپنے کو فی الواقع بندے اور محکوم ہی یقین کیے ہوئے اور اس کے اقتدارِ اعلیٰ کے حضور پوری عقیدت سے جھکے ہوئے ہوں، اپنے لیے کسی حاکمانہ اقتدار کے زعم باطل کا شکار ہرگز نہ ہوں۔ فیصلوں کا انحصار سرتاسر حق اور انصاف پر ہو، طاقت یا جانب داری پر قطعاً نہ ہو۔ حکومتی نظام کا اصل فریضہ نیکی کا فروغ، بدی کی بیخ کنی، عدل کا بے لاگ نفاذ اور ظلم کا مکمل استیصال ہو۔ مختصر یہ کہ دین اسلام، جس طرزِ حیات کا نام ہے وہ اپنی سچی روح اور صحیح قالب کے ساتھ پوری طرح مجسم ہو کر دنیا کی نگاہوں کے سامنے جلوہ گر ہو گیا ہو، جس طرح کہ اپنے ابتدائی دور میں سالہا سال تک جلوہ گر رہ چکا ہے۔ چنانچہ دستور اس معیار مطلوب کی تعیین کرتے ہوئے کہتا ہے کہ:

> ''اس دین کی اقامت کا مثالی و بہترین عملی نمونہ وہ ہے جسے حضرت محمد ﷺ اور حضرات خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے قائم فرمایا۔'' (ص:۸)

مخاطب

دعوت کی ہمہ گیری

کسی بھی تحریک کے بارے میں جو سوالات سب سے پہلے اٹھتے ہیں، ان میں سے ایک سوال یہ بھی ہوتا ہے کہ یہ تحریک کن لوگوں کے لیے ہے یا کن افراد کو اپنا مخاطب بناتی ہے؟ مثلاً سرمایہ درانہ نظام کے قیام کی تحریک، معیشت کے اہم ذرائع پر قابض ہو سکنے والے افراد کے لیے، اور کمیونسٹ تحریک مزدوروں اور کسانوں کے لیے ہوتی ہے، اور انھیں کو دعوت اجتماع دیتی ہے۔ اسی طرح قوم پرستانہ تحریک کسی ایک خاص قوم کو، اور پاپائیت صرف مذہبی پیشواؤں کو ایک مرکز پر اکٹھا کرنا چاہتی ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی کے بارے میں بھی یہ معلوم ہو جانا ضروری ہے کہ اس کے مخاطب کون لوگ ہیں، اور اس کی دعوت کن اشخاص کے لیے ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اس تحریک کے نصب العین پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا، جسے ضروری وضاحتوں کے ساتھ ابھی پیش کیا جا چکا ہے۔ یہ نصب العین جس دین کی اقامت کا نصب العین ہے وہ اللہ کا آخری، عالمی اور ابدی دین ہے، اور اس کا اتباع اب ہر ایک کے لیے ضروری اور شرط نجات ہے۔ اسلام کی یہ حیثیت فطری طور پر اس بات کو ضروری قرار دیتی ہے کہ اس کی اقامت کی تحریک بھی عالمی اور ابدی ہی ہو، پوری نوع انسانی اور اس کا ایک ایک فرد اس کا مخاطب اور مطلوب ہو اور قوم، نسل، وطن، رنگ اور زبان کے اختلافات اس کے نزدیک مطلق کوئی اہمیت نہ رکھیں۔ چنانچہ قرآن مجید نے بھی ـــــ جو اس تحریک کا اصل سرچشمہ ہے ـــــ اپنے واضح اعلانات کے ذریعے، اور اس کے لانے والے پیغمبر حضرت محمد ﷺ نے بھی ـــــ جو دعوت قرآنی کے اصل

علمبر دار تھے ـــــ اپنے قول و عمل دونوں کے ذریعہ اس حقیقت کو بالکل روشن کر دیا ہے۔[1] اس لیے ناگزیر تھا کہ تحریک اسلامی کا بھی خطاب عام اور ہمہ گیر ہو اور وہ کسی امتیاز کے بغیر ہر بندۂ خدا کو اپنا مخاطب بنائے، ہر ایک کو اپنا پیام پہنچائے اور کسی کو بھی اپنی دعوت رحمت سے محروم نہ رکھے۔ چنانچہ پہلے دن سے اس نے اپنی حیثیت اور نوعیت یہی رکھی ہے۔ اس کے دستور میں صراحت سے کہا گیا ہے:

> ''انڈین یونین[2] کا ہر شہری، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، جماعت اسلامی ہند کا رکن بن سکتا ہے، بشرطیکہ وہ..... الخ (ص۔۱۰)

''بشرطیکہ وہ'' کے بعد وہ بنیادی اصول اور عملی شرائط بیان کی گئی ہیں جن کا تسلیم کیا جانا تحریک سے باضابطہ وابستہ ہونے کے لیے ضروری ہے۔

اسی طرح جب بھی اس کا پروگرام بنا یہ وضاحت اور اعلان لازماً اس کا جزو رہا کہ:

> ہماری دعوت کے مخاطب مسلم اور غیر مسلم دونوں ہی ہوں گے .... ہماری شرعی ذمہ داری کا تقاضا ہے کہ دعوت کا کام کسی تخصیص اور امتیاز کے بغیر ہر طبقہ کے لوگوں میں کیا جائے۔'' (جماعت اسلامی ہند کی پالیسی اور پروگرام)

ایک فطری تقسیم

تحریک اسلامی کا مخاطب اور مطلوب اگرچہ ہر شخص ہے، مگر ظاہر ہے کہ وہ جس دین کی اقامت چاہتی ہے، اس کے بارے میں سب لوگ یکساں ذہن نہیں رکھتے، بلکہ دو الگ الگ نقطہ ہائے نظر رکھنے والے گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو فی الجملہ اس دین کے ماننے والے ہیں اور مسلم کہلاتے ہیں، دوسرا گروہ ان دوسرے لوگوں کا ہے جو اسے نہیں مانتے اور غیر مسلم ہیں۔ ہر شخص جانتا ہے کہ ان دونوں قسم کے لوگوں کی نفسیات اور جذبات و احساسات اسلام کے بارے میں نہ ایک طرح کے ہیں نہ ہو سکتے ہیں اور اس معاملے میں ان کے درمیان مشرق اور مغرب کا بُعد پایا جاتا ہے۔ چنانچہ پہلے گروہ کے افراد اس کے احکام کی بجا آوری میں چاہے کتنے ہی کوتاہ کار کیوں نہ ہوں اور ان کی زندگیوں پر اسلامی نظام کے بجائے کسی اور ہی نظام اور ازم کی حکمرانی کیوں نہ پائی جاتی ہو، ان سب باتوں کے باوجود انھیں بالعموم

اس سے عقیدت ہے، وہ اس سے ذہنی، جذباتی اور روحانی وابستگی رکھتے ہیں، اسے حق اور موجب فلاح باور کرتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ اس کا کلمہ بلند ہو — لیکن دوسرے گروہ کے لوگوں کا حال اس سے بالکل مختلف ہے۔ انھیں اسلام سے کوئی عقیدت نہیں، کوئی انس نہیں، کوئی ذہنی یا جذباتی وابستگی نہیں، اس کے بنیادی تصورات، اس کا مزاج، اس کی اصطلاحات اور اس کی قدریں، سب کی سب ان کے لیے یکسر اجنبی ہیں اور اس کے ساتھ ان کا رویہ یا تو انکار و مخالفت کا ہے، یا بے تعلقی اور بے پروائی کا۔ اسلام کے بارے میں ان دونوں گروہوں کا یہ ذہنی اور جذباتی اختلاف، لازم ٹھیراتا ہے کہ تحریک اسلامی کے بارے میں بھی ان کا ذہنی اور جذباتی ردعمل مختلف اور متضاد ہی ہوگا۔

جب صورت واقعہ یہ ہے تو عقل عام کہتی ہے کہ تحریک پہلے گروہ کو جس انداز سے خطاب کرسکتی ہے، دوسرے کو ہرگز نہیں کرسکتی۔ ورنہ اس کی باتیں اس کے لیے بالکل لغو اور لایعنی بن کر رہ جائیں گی، اور ذہنوں میں گھسنے کی کوئی راہ نہ پاسکیں گی۔ یہی وجہ ہے کہ تحریک اسلامی اگرچہ ان دونوں ہی قسم کے لوگوں کو اپنا مخاطب اور مطلوب سمجھتی ہے، مگر اپنا پیغام پہنچاتے وقت وہ انھیں دو الگ الگ خانوں میں رکھتی ہے، اور ہر ایک سے ایک مخصوص انداز میں اور ایک خاص استدلال کے ذریعے بات کرتی ہے جو ان کی نفسیات اور ذہنی حالات کے عین مطابق ہوتا ہے۔ کیونکہ عقل اور حکمت دعوت کا یہ ایک بنیادی تقاضا ہے۔

(۱) مسلمان اور ان کی تحریکی اہمیت

ان دونوں گروہوں میں سے پہلے گروہ یعنی مسلمانوں کی حیثیت تحریک کے مخاطب اوّل کی ہے اور وہ انھیں پہلے آواز دیتی ہے۔ جس کی مختلف وجوہ ہیں:

(۱) سب سے پہلی اور اہم وجہ تو یہ ہے کہ مسلمانوں کی حیثیت دراصل اس تحریک کے خاموش اقراری ارکان کی ہے۔ کیونکہ جو شخص بھی اپنے کو مسلمان کہتا ہے اس کا یہ کہنا فی الواقع اس

---

[1] تفصیل کے لیے ''اسلام ایک نظر میں'' کا مطالعہ کیجیے۔

[2] ''انڈین یونین کا شہری'' ہونے کی قید محض ضابطے کی رکنیت اور جماعتی نظم کی حد تک رکھی گئی ہے اور ایسا صرف سیاسی ضرورت کی بنا پر کیا گیا ہے ورنہ جہاں تک اصل دعوت کا تعلق ہے وہ فطری طور پر کسی بھی قید اور حد بندی سے ماوراء ہے۔

بات کا اقرار اور اعلان ہوتا ہے کہ وہ اسلام کے مشن کا علمبردار ہے، اس 'امت مسلمہ' کا ایک فرد ہے جو دنیا میں حق کی شہادت دینے ہی کے لیے برپا کی گئی ہے، اس خیر امت کا جزو ہے، جس کا مقصد وجود ہی 'معروف' کا حکم دینا اور 'منکر' سے روکنا ہے، اس دین کا پیرو ہے جو نازل اور مشروع ہی اس لیے کیا گیا ہے کہ اسے قائم کیا اور قائم رکھا جائے۔ اس لیے اگر آج صورت واقعی یہ ہے کہ اسلام کا مشن صرف کتاب الٰہی کے صفحات کی زینت بن کر رہ گیا ہے، حق کی شہادت غفلتوں کی نذر ہو چکی ہے، معروف کی کوئی پرسش باقی نہیں رہ گئی ہے، منکر کا سکہ ہر طرف رواں ہے، اور اللہ کا مشروع کیا ہوا دین صرف عام انسانی زندگی ہی سے نہیں، بلکہ خود مسلمانوں کی بھی زندگی سے بڑی حد تک بے دخل ہو کر رہ گیا ہے تو مسلمان کہا جانے والا کوئی بھی شخص اس صورت حال کو بدل ڈالنے کی بھاری ذمہ داریوں سے کسی طرح بھی بری اور بے تعلق خیال نہیں کیا جا سکتا۔ یوں کہیے کہ ایسی حالت میں ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کی جدوجہد ہی وہ امتیازی علامت ہوگی جس سے وہ پہچانا جا سکتا ہے۔ کوئی اپنی زبان سے کہے یا نہ کہے، اور اس کا طرز عمل چاہے جیسا کچھ بھی ہو، مسلمان ہونے کے باعث اس زمین پر اللہ کے دین کی شہادت اور اقامت کا کام ہی اس کا پہلا اور آخری فریضۂ حیات ہے۔ پس ایک مسلمان کا موقف اصلاً ٹھیک وہی موقف ہوتا ہے جو تحریک اسلامی کے ایک رکن کا ہے۔ اس لیے ہر مسلمان کو اس دعوت کا ''خاموش اقراری رکن'' کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا۔ اب اگر کوئی شخص مسلمان تو ہے مگر اس تحریک سے عملاً وابستہ نہیں ہے تو اس کی وجہ یا تو یہ ہوگی کہ وہ اس کے مخصوص نظام سے یا اس کے کچھ تفصیلی افکار سے متفق نہیں ہے، ورنہ جہاں تک اس کے اصل مقصد اور نصب العین کا تعلق ہے وہ بھی اسی کو اپنا مقصد اور فریضہ سمجھے اور بنائے ہوئے ہے، یا یہ ہوگی کہ جہل اور ناواقفیت کی بنا پر وہ اپنی دینی حیثیت اور منصبی ذمہ داریوں سے ناآشنا ہو چکا ہے، یا پھر یہ ہوگی کہ وہ خدانخواستہ اپنے دعوائے اسلام ہی میں مخلص نہیں ہے۔

مسلمانوں کی اصل حیثیت اور ان کا حقیقی موقف جب یہ ہے تو تحریک کو فطری طور پر انہیں اپنا یگانہ سمجھنا اور سب سے پہلے بلانا بالکل ضروری تھا۔ کیونکہ انہیں بلانا دراصل اپنی ہی ''پارٹی'' کے افراد کو بلانا ہے، تاکہ سب جمع ہو کر پارٹی کے مقصد کی خاطر پھر سے سرگرم ہو سکیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ وہ کام ہے جو سب سے پہلے ہونے کا ہے۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ مسلمان اپنے عمل میں چاہے جیسا بھی ہو، لیکن جب تک وہ مسلمان ہے اس وقت تک وہ بہر حال امت مسلمہ ہی کا جزو ہے، اور اس لیے دوسرے افراد ملت پر اس کے بھی وہی دینی اور ملی حقوق ہیں جو کسی بھی مسلمان کے ہو سکتے ہیں۔ ان حقوق میں سے ایک حق اور بہت بڑا حق، اس کا یہ بھی ہے کہ اس کے ساتھ نصح و خیر خواہی کا رویہ اختیار کیا جائے، اسے معروف کی تلقین کی جائے اور منکر سے روکا جائے۔ کوئی شک نہیں کہ ایک مسلمان کو صحیح معنوں میں مسلمان بنا دینے اور اپنے مقصد حیات کے لیے اسے سرگرم عمل کر دینے کی کوشش اس کے ساتھ سب سے بڑی نصح اور خیر خواہی ہے، اسے سب سے عظیم معروف پر عمل پیرا بنا دینا اور سب سے اہم منکر سے بچالینا ہے۔ اس لیے تحریک کے کارکنوں پر لازم ہے کہ وہ دوسرے مسلمانوں کا یہ حق بہر حال ادا کریں۔ بلا شبہ دوسرے بندگان خدا کا بھی یہ مسلمہ حق ہے کہ ان تک اسلام کا پیام پہنچایا جائے اور انھیں منکرات سے روک کر سارے باطل عقائد اور برے اعمال سے پاک بنا دینے کی پیہم جدوجہد کی جائے، لیکن اس میں بھی کوئی شبہ نہیں کہ قرآنی ہدایات کی رو سے افراد امت کا حق نصح اور ان کی اصلاح کا فریضہ دوسرے لوگوں کی نصح و خیر خواہی کے حق اور ان کی اصلاح کے فریضے سے مقدم ہے۔

(۳) تیسری وجہ یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کا اس تحریک کے قریب آنا بڑی حد تک اس بات پر موقوف ہے کہ ان کے گرد و پیش پائے جانے والے مسلمان واقعی مسلمان ہوں اور ان کی زندگیاں نمایاں طور پر اسلام کا مظہر بن جائیں۔ یہ اس لیے کہ غلط یا صحیح، انھیں اسلام کا نمائندہ خیال کیا جاتا ہے اور دوسرے لوگ اسلام کو اس کے اصل سرچشموں یعنی کتاب وسنت کے صفحات کے بجائے بالعموم ان ہی مسلمانوں کے اخلاق و کردار سے سمجھا کرتے ہیں۔ یہ طریقہ راست فکری اور صحیح اصول تحقیق کے قطعی خلاف ضرور ہے، لیکن صورت واقعہ بہر حال یہی ہے، اور اس کے نتائج سے بچنا ممکن نہیں ہے۔ اس لیے جب تک مسلمانوں کی عملی زندگی اسلام سے ہٹی ہوئی ہے وہ دنیا کے لیے اس کے چہرے کا نقاب بنی رہے گی، اور اس بات کی مشکل ہی سے کوئی توقع کی جا سکے گی کہ وہ اسے صحیح شکل میں دیکھ پائے گی اور دیکھ کر اس کے فطری حسن سے مسحور ہو سکے گی۔ یہ ایک زبردست نفسیاتی حقیقت ہے، اور اس کا کھلا ہوا تقاضا ہے کہ دوسرے بندگان خدا کو اسلام کی دعوت دینے کے لیے بھی پہلے خود ان مسلمانوں کو اسلام آشنا بنایا جائے جو اپنے فرض کو بھولے

ہوئے ہیں۔ ورنہ ان کا موجودہ طرزِ عمل اس دعوت کا راستہ بڑی بے رحمی سے روکے رہے گا۔

یہ ہیں وہ اہم وجوہ جن کے باعث مسلمان اس تحریک کے مخاطب اوّل ہیں:

(۲) غیر مسلم اور ان کی تحریکی اہمیت

مسلمانوں کے مخاطب اوّل ہونے کے معنی یہ کسی طرح نہیں ہیں کہ دوسرے بندگان خدا کے لیے اس تحریک کا خطاب ایک دن بھی موخر رہ سکے۔ کیونکہ اس سلسلے میں جہاں کچھ وجوہ کی بنا پر مسلم گروہ کو اولیت کا مقام حاصل ہے وہیں غیر مسلموں کی بھی بعض ایسی مخصوص اہمیتیں ہیں جن کے باعث انھیں ایک لمحے کے لیے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

(۱) سب سے پہلی بات تو یہ کہ ایک طرح سے اس تحریک کی بنیادی حیثیت اور غایت مسلمانوں کو نہیں، بلکہ غیر مسلموں ہی کو خطاب کرنے والی تحریک کی ہے۔ یہ اس لیے کہ یہ تحریک اپنی اصل کے اعتبار سے وہی تحریک ہے جو دعوت قرآنی کی رہی ہے اور جس کی علم برداری ہمیشہ کے لیے امت مسلمہ کا واحد فریضہ قرار پائے ہوئے ہے۔ قرآن حکیم میں مسلمانوں کا مشن اور مقصد وجود جو کچھ بتایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ پوری نوع انسانی کے سامنے وہ دین حق کے شاہد اور نگراں ہوں گے ....

لِتَكُوْ نُوْاشُهَدَآ ءَ عَلَى النَّاسِ ؈ (البقرہ: ۱۴۳)

(تا کہ تم دنیا کے تمام انسانوں پر گواہ رہو۔)

اور یہ کہ انھیں لوگوں (کی ہدایت) کے لیے برپا کیا گیا ہے۔

كُنْتُمْ خَيْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاس ....وَتُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ

(آل عمران: ۱۱۰)

(اب دنیا میں وہ بہترین گروہ تم ہو جسے انسانوں کی ہدایت و اصلاح کے لیے میدان میں لایا گیا ہے، تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بدی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔)

قرآن حکیم کے یہ عَلَى النَّاسِ اور لِلنَّاسِ، کے الفاظ اس حقیقت کا صریح اعلان ہیں کہ امت مسلمہ اللہ رب العالمین کی طرف سے ایک خاص مشن پر مامور ہے اور اسے اہتمام کے ساتھ ایک خاص کام کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ یہ خاص مشن ساری دنیا کے سامنے

شہادت حق کا مشن ہے، اور یہ خاص کام پوری نوع انسانی کو خدا آگاہ اور پیرو حق بنانے کا کام ہے۔ جب امت مسلمہ کا مشن اور اس کی غایت وجود یہ ہے تو اس کے اندر سے اٹھنے والی تحریک اقامت دین کا موقف بھی اس سے مختلف نہیں ہوسکتا اور ضروری ہے کہ اس کا رخ اَلنّاس ہی کی طرف ہو۔ لیکن اس وقت چونکہ امت ایک غیر معمولی صورت حال سے دوچار ہے اور اس کی بہت بڑی اکثریت خودفراموش بن کر رہ گئی ہے، جسے اللہ پر ایمان اور قرآن کی پیروی کا دعویٰ تو ضرور ہے، مگر اس دعوے کے عملی تقاضوں سے اس کی زندگی افسوس ناک حد تک ناآشنا ہو چکی ہے، اس لیے ضروری ہو گیا کہ تحریک خود مسلم گروہ کو بھی اپنا مخاطب بنائے اور سب سے پہلے بنائے، اور اس پر پوری پوری توجہ دے۔ کیونکہ یہی تو اس زمین کا وہ 'نمک' تھا جس سے باقی پوری دنیا کو 'نمکین' بنایا جانا تھا، جب وہی اپنی نمکینی کھو بیٹھا ہے تو اس وقت تک دوسروں کو نمکین بنانے کا کام انجام ہی نہیں پاسکتا، جب تک کہ خود اس کی کھوئی ہوئی نمکینی اس کے اندر پھر سے واپس نہیں آجاتی۔ گویا اس تحریک کا جو اصل کام تھا خود اسی کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کی تجدید ایمان اور اصلاح عمل پر اولین توجہ کی جاتی۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اگر مسلمان اپنے کو بھول نہ گئے ہوتے اور ان میں ایمان و عمل کی خرابیاں نہ ہوتیں تو یہ تحریک اپنے اصل فریضے کے لیے ہی یکسو ہوتی اور اس کی دعوتی سرگرمیاں تمام تر بیرونی دنیا ہی کے لیے وقف رہتیں۔ اب اگر وہ اس کام کے لیے یکسو نہیں ہے تو ایسا اس لیے نہیں ہے کہ اسے اصلاً ایسا ہونا ہی چاہیے تھا، بلکہ اس لیے ہے کہ ایک زبردست عارض پیش آگیا تھا جس نے اس کے لیے ہر آئینہ ضروری ٹھہرا دیا کہ وہ اپنی توجہ مسلمانوں کی طرف بھی پوری شدت سے مبذول کر دے۔ ورنہ جہاں تک اس کی اصل حیثیت کا تعلق ہے، اس کا تقاضا تو یہی تھا کہ وہ اپنی دعوتی جدوجہد کا رخ پوری طرح غیر مسلموں ہی کی طرف رکھتی اور وہی اس کا میدان کار ہوتے۔

(۲) دوسری بات یہ کہ خود اس تحریک کا اپنا مفاد اسے ضروری قرار دیتا ہے۔ یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ہر ملک اور ہر دور کی طرح اس ملک میں بھی کوئی اسلامی تحریک کامیابی کی منزل پر اسی وقت پہنچ سکتی ہے جب یہاں کے باشندوں کی ایک معقول تعداد صدق دل سے اس کی ہم نوا ہو چکی ہو۔ لیکن یہاں کی صورت حال یہ ہے کہ ان باشندوں کی نوے فی صد اکثریت غیر مسلموں پر مشتمل ہے۔ پھر ان کا عددی تناسب ہی اتنا زیادہ نہیں ہے، بلکہ ان کی معاشی اور

سیاسی حیثیت بھی بہت اونچی ہے۔ کہنا چاہیے کہ حاکمانہ اقتدار انھی کے ہاتھوں میں ہے۔ ایسی حالت میں بڑی بے دانشی ہوگی اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کی طرف سے صرف نظر کر کے بھی تحریک کا مستقبل تابناک ہوسکتا ہے اور ان کی ایک قابل لحاظ تعداد کو اپنا دست و بازو بنائے بغیر بھی منزل مقصود کے قریب پہنچا جاسکتا ہے۔ اس لیے تحریک کی یہ ایک ناگزیر عملی ضرورت ہے کہ وہ غیر مسلم باشندگان ملک کو بھی پوری توجہ سے اپنا مخاطب بنائے اور انھیں اپنی صفوں میں لانے کی انتھک جدوجہد کرے۔

(۳) تیسری چیز بھائی چارہ کے اس مضبوط رشتے کے حقوق کا پاس ولحاظ ہے جو ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہونے کے باعث سارے بنی آدم کے درمیان فطری طور پر موجود ہے اور جو زبان، رنگ، نسل، وطن اور افکار وعقائد کے ہزار اختلافات کے باوجود بہر حال موجود رہتا ہے۔ یہی رشتہ وہ سرچشمہ ہے جس سے ایک انسان کے اندر دوسرے کے لیے محبت اور خیر خواہی کے فطری جذبات پیدا ہوتے ہیں۔ جب تک کسی انسان کی انسانیت بالکل ہی مر نہ جائے وہ ان جذبات اخوت سے خالی نہیں ہوسکتا۔ یہ فطری جذبات اسے اس بات پر ابھارتے ہیں کہ وہ اپنے ہم جنسوں سے الفت ومحبت رکھے، ان کا بھلا چاہے، مصائب میں ان کی دست گیری کرے، اور خطرات میں گھرا دیکھ کر انھیں ان سے بچا لینے کے لیے بے چین ہو جائے۔ کم از کم اسلام نے تو یہی چاہا ہے اور اپنے پیرووں کو اسی کی تلقین کی ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی کے علمبرداروں کے لیے اپنے اندر ان اعلیٰ جذبات کی پرورش اور ان کے عملی تقاضوں کی انجام دہی بہر حال ضروری ہے۔ محبت اور خیر خواہی کے ان عملی تقاضوں میں سب سے زیادہ اہم تقاضا دوسروں کے نزدیک چاہے جو کچھ ہو، مگر اسلام کے نزدیک اور اس تحریک اسلامی کے نزدیک بھی، یہ اور صرف یہ ہے کہ افراد انسانی کو آخرت کی ابدی ناکامی سے بچایا جائے۔ یہی ان کی سب سے بڑی اور حقیقی خیر خواہی ہے۔ اب جبکہ اس دعوت کا اصل مقصود ہی یہ ہے کہ اللہ کے بندے اس کی سچی بندگی کی صراط مستقیم اختیار کر کے اس کی رضا اور آخرت کی کامیابی کے سزاوار بن جائیں اور اخروی زندگی کی ابدی نامرادیوں سے محفوظ ہو رہیں، تو اس کے لیے یہ کسی طرح ممکن نہیں تھا کہ اس صراط مستقیم سے ناواقفیت کی بنا پر ان ابدی نامرادیوں کی طرف بڑھے چلے جانے والے انسانوں کی طرف سے آنکھیں بند رکھتی، انھیں ہلاکت کے یقینی خطرات میں گھرا دیکھتی مگر ان سے انھیں بچا لینے

کے لیے کوئی بے چینی محسوس نہ کرتی، کوئی آواز نہ دیتی، کوئی قدم نہ اٹھاتی، کوئی شک نہیں کہ اگر وہ ایسا کرتی تو اپنے کو خود آپ ہی جھٹلا دیتی۔ بلکہ اپنے وجود تک کی نفی کر دیتی۔ انسانی ہمدردی، محبت اور بہی خواہی کا فطری جذبہ تو اتنا گہرا، اتنا مضبوط اور اتنا بلند جذبہ ہے کہ بالفرض اللہ کی طرف سے اہل ایمان پر دعوت حق کی ذمہ داری صراحت سے نہ ڈالی گئی ہوتی، تب بھی یہ جذبہ انھیں خاموش ہرگز نہ بیٹھنے دیتا، بلکہ اس بات پر برابر ابھارتا رہتا کہ خدا سے غافل اور اس کی رحمتوں سے محروم ٹھیرنے والے ان بھائیوں کو جس طرح بھی بن پڑے اس کے آستانے پر لا کھڑا کریں اور اس طرح انھیں بھی اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا مستحق بنا دیں۔

یہ ہیں وہ اسباب جو تحریک اسلامی کے لیے ضروری قرار دیتے ہیں کہ غیر مسلم افراد انسانی کو بھی وہ اپنا مخاطب بنائے، انھیں اپنی دعوت پہنچائے اور اس بارے میں کسی بے پروائی، کسی کم کوشی اور کسی مصلحت اندیشی سے ہرگز کام نہ لے۔

طریقِ دعوت

دعوت کا بنیادی وصف

اسلام ایک عقلی اور بُرہانی مذہب ہے اور قرآن حکیم کی دعوت خالص تعقل اور تذکر کی دعوت ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی بھی اپنی دعوت کے سلسلے میں نہ تو کسی جبر اور تحکم سے کام لینے کی روادار ہوسکتی ہے، نہ سطحی جذباتیت کو کوئی مقام دے سکتی ہے، نہ عوام فریبی اس کے شایان شان ہوسکتی ہے، اور نہ ذہنوں کو مسحور اور دماغوں کو ماؤف کر دینے والے نعرے اور پروپیگنڈے اپنا سکتی ہے۔ کیونکہ یہ طور طریقے نہ اس کے مزاج سے کوئی مناسبت رکھتے ہیں، نہ اس کے حق میں ذرا بھی مفید اور کارآمد ہوسکتے ہیں۔ اس لیے وہ ان باتوں سے ٹھیک اسی طرح دور رہتی ہے جس طرح ایک شریف آدمی یاوہ گوئیوں اور پست حرکتوں سے دور رہتا ہے۔ اس کا خطاب راست انسان کی عقل سے ہوتا ہے، وہ اس کی فطرت کو جگاتی اور اس کے اعلیٰ جذبات کو آواز دیتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسے اپنی بات کہنے کے لیے ماحول کے سکون اور ذہنوں کی سنجیدگی، غور و فکر کی کارفرمائی اور دلوں کی حاضری کی تلاش رہتی ہے اور ان چیزوں کو پاکر جب گفتگو کرتی ہے تو مؤثر اور ٹھوس دلائل کی زبان سے کرتی ہے اور مخاطب کے دل و دماغ کو مطمئن کر کے ہی اپنی بات منوانا چاہتی ہے۔ کیونکہ وہ جس نصب العین کی تحریک ہے صرف ایسے ہی لوگ اس کے کام کے ہوسکتے ہیں جن کے دل کی گہرائیوں میں ایمان پوری طرح اتر گیا ہو۔ ظاہر ہے کہ دل کی گہرائیوں میں کوئی بات مضبوط اور اطمینان بخش دلائل ہی سے اترا کرتی ہے، جبر و زور یا پُرفریب نعروں سے نہیں۔

دعوت کا راست انداز

اللہ کے دین کے اصل داعی انبیاء علیہم السلام رہے ہیں۔ ان حضرات نے یہ دعوت بالکل راست انداز میں پیش کی تھی۔ کسی نے بھی کوئی ہیر پھیر کا راستہ نہیں اپنایا، کسی ابہام سے کام نہیں لیا، کوئی ڈپلومیٹک طریقہ اختیار نہیں کیا، کسی دور کی تمہید کی نہیں سوچی، بلکہ اپنی بات لوگوں کے سامنے پہلے ہی دن بالکل صاف صاف اور بے لاگ طریقے سے رکھ دی، اپنی دعوت کی ابتداء ہی دین کی اصل بنیادوں ——— اللہ کی وحدانیت آخرت اور اپنی رسالت ——— پر ایمان لانے کے مطالبے اور اللہ کی بندگی کی تلقین سے کی۔ اس لیے یہ تحریک و دعوت اسلامی بھی اسی طریقے اور اصول کی پابندی ہے۔ چنانچہ وہ کسی اینچ پیچ یا کسی ابہام و ایہام یا کسی غیر ضروری تمہید کے بغیر خدا کے بندوں کو اس کی بندگی کا پیغام پہنچا رہی ہے اور اس کی رضا اور آخرت کی فلاح کو اپنی زندگی کا مقصود بنا لینے کی دعوت دے رہی ہے۔ یہ طریق دعوت صرف اسی لیے ضروری نہیں ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا اسوہ یہی رہا ہے، بلکہ اس لیے بھی ضروری ہے کہ اس دعوت کے مقصد کے حصول کا فطری راستہ ہی یہی ہے۔

بنیادی اور اصولی طریقے

اس تحریک نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے جو بنیادی اصول یا اصولی طریقے اختیار کیے ہیں، ان کا سرچشمہ قرآن کریم، بالخصوص اس کی یہ آیت ہے:

اُدْعُ اِلیٰ سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ
بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ ٥ (النحل: ۱۲۵)

(اپنے رب کے راستے کی طرف حکمت سے اور موعظت حسنہ سے بلاؤ، اور لوگوں کے ساتھ ایسے طریقے سے جدال کرو جو سب سے اچھا طریقہ ہو۔)

اس آیت میں، جو طریق دعوت کے بارے میں قرآن کریم کی سب سے واضح اور سب سے جامع ہدایات پر مشتمل ہے، اللہ کے بندوں کو اس کی بندگی کی راہ کی طرف بلانے کے لیے تین اصولی طریقے متعین فرمائے گئے ہیں:

(۱) حکمت کا طریقہ۔ (۲) موعظت حسنہ کا طریقہ (۳) جدال احسن کا طریقہ۔

''حکمت'' کے معنی پکی بات کے ہیں، جس کا مطلب یہ ہے کہ جو بات کہی جائے وہ پوری طرح مدلل، مؤثر اور طمانیت بخش ہو۔

''موعظت حسنہ'' کے معنی اچھی نصیحت کے ہیں۔ 'اچھی نصیحت' اس کو کہتے ہیں جو اخلاص وللہیت، دردوسوز اور نصح وخیر خواہی کے جذبات سے بھری ہوئی ہو، جس کا انداز پُر اثر اور دلوں میں اتر جانے والا ہو۔

''جدال احسن'' کے معنی بہتر انداز کے بحث و مذاکرات کے ہیں۔ یعنی بحث و استدلال کا ایسا طریقہ، جو مقصد دعوت کے لحاظ سے موزوں ترین ہو، جس میں لب ولہجہ کی متانت، کلام کی بلندی، استدلال کا حسن، انداز گفتگو کی کشش اور اثر انگیزی کا جوہر موجود ہو اور کٹ حجتی، تلخی، طنز اور دل آزاری کا شائبہ تک نہ ہو۔

دعوت کے یہ تینوں اصولی طریقے درحقیقت تین مختلف قسم کے لوگوں کو پیش نظر رکھ کر متعین فرمائے گئے ہیں۔ پہلے طریقے کا تعلق اصلاً غیر مسلم افراد کو دعوت دینے کے کام سے ہے۔ دوسرے کا تعلق اصلاً خود مسلمانوں کے معاملے سے ہے اور تیسرے کا تعلق ان لوگوں سے، بالخصوص ان غیر مسلم افراد کے معاملے سے ہے جو بحث ومناظرہ پر اتر آئیں۔ اس طرح یہ آیت طریق دعوت کے پورے مسئلے کو اپنے احاطے میں لے لیتی ہے اور صراحت کے ساتھ بتا دیتی ہے کہ کس قسم کے مخاطب کے ساتھ بنیادی طور پر دعوت وتلقین کا کون سا طریقہ بالعموم اختیار کیا جانا چاہیے۔

اس ہدایت الٰہی کی رہنمائی میں تحریک اسلامی اپنی دعوت کے سلسلے میں جن بنیادی طریقوں پر کاربند ہے اور جن کی موزونیت اور ضرورت عقل کو بھی پوری طرح تسلیم ہے، ان کی ضروری وضاحت یہ ہے:

(۱) غیر مسلموں کے بارے میں دعوت کا طریقہ اصلاً 'حکمت' اور دلیل و برہان کا ہے۔ وہ انھیں دین حق کی طرف مضبوط، موثر اور دل نشین دلائل کی زبان سے بلاتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ اسلام سے ناواقف اور باطل افکار وعقائد کے معتقد ہوتے ہیں اور اپنے ان عقائد کو ترک کر کے اسلام کی صداقت کو اس وقت تک قبول کر ہی نہیں سکتے، جب تک کہ ان پر اپنے مسلک اور عقیدے کا باطل ہونا اور اسلامی اصول وعقائد کا حق ہونا اچھی طرح آشکارا نہ کر دیا جائے اور اس بارے میں دو رائیں ہرگز نہیں ہوسکتیں کہ یہ کام دلیلوں ہی کے ذریعے انجام دیا جاسکتا ہے۔

یہ دلائل جنھیں تحریک اسلامی اپنی دعوت کے حق میں پیش کرتی ہے، قدرتی طور پر مثبت اور منفی دونوں ہی قسم کے ہوتے ہیں۔ یعنی ایک طرف تو وہ اسلام کی بنیادی تعلیمات ـــــ توحید، آخرت اور نبوت ـــــ کو دلائل سے برحق ثابت کرتی ہے۔ دوسری طرف دلائل ہی کے ذریعہ ان کے اپنے موروثی عقائد و افکار کا غیر منطقی، خلاف حق اور باطل ہونا بھی واضح کرتی ہے اور پھر اس حق کی پیروی کے ثمرات اور اس باطل کے اتباع کے نتائج سے انھیں باخبر کر کے قبول اسلام کی دعوت دیتی ہے۔ یہی اس کی دعوت کا بنیادی طریقہ ہے۔ یقیناً اپنی دعوتی گفتگوؤں میں وہ موقع کی مناسبت اور مخاطب کی مخصوص ذہنیت کی رعایت کو بھی نظر انداز نہیں کرتی۔ لیکن اس سلسلے میں جو کچھ بھی کہتی ہے اس کی حیثیت بالکل ثانوی بھی ہوتی ہے اور بالکل وقتی اور عارضی بھی۔

(۲) مسلمانوں کو اپنا پیغام پہنچانے اور انھیں اللہ کے راستے کی طرف دعوت دینے کے لیے تحریک بنیادی طور پر ''موعظت حسنہ'' کا طریقہ اختیار کرتی ہے، نہ کہ استدلال اور اثبات دین کا۔ یہ اس لیے کہ مسلمانوں کا موقف اس معاملے میں دوسروں کے موقف سے بالکل مختلف ہے، جس کے باعث انھیں اس مقام پر رکھ کر ہرگز نہیں پکارا جا سکتا جس پر کہ اوروں کو رکھ کر پکارا جاتا ہے۔ ورنہ یہ صورت واقعی اور مصلحت دعوت دونوں کے خلاف ہوگا۔ مسلمان نہ اسلام کا منکر ہوتا ہے نہ اس سے فکری اور جذباتی طور پر بے گانہ، کہ اسے اس دین پر ''ایمان لانے'' کی دعوت دی جائے اور اس غرض سے اس کے سامنے توحید و رسالت کے دلائل پیش کیے جائیں، یا اسلامی طریق زندگی کا برحق ہونا ثابت کیا جائے۔[1] کوئی شک نہیں کہ اس کے موقف کے لحاظ سے یہ کوشش بالکل بے ضرورت بھی ہوگی اور یکسر بے محل بھی۔ اسے اللہ کے راستے کی طرف بلانے کی ضرورت تو صرف اس لیے ہے کہ وہ اس راستے کو حق و صواب کا راستہ کہنے اور ماننے کے باوجود اپنی ایمانی کمزوری یا جہل و ناواقفیت کی بنا پر رہ کر اس سے دور ہٹ جایا کرتا

---

[1] اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ مسلمانوں کے معاملے میں توحید و آخرت کے دلائل ہر حیثیت سے بالکل بے ضرورت اور بے سود ہیں۔ نہیں، ان کی اہمیت اور افادیت یہاں بھی اپنی جگہ مسلم ہی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعہ خام کار لوگوں کے ایمان میں پختگی آتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کو سچا مسلمان بنانے کے لیے جہاں وہ موعظت حسنہ سے کام لیتا ہے وہیں وہ انھیں توحید، آخرت، رسالت محمدی اور اپنے کتاب الٰہی ہونے کے دلائل بھی سناتا ہے۔ یہ اس لیے کہ سیرت و کردار کی خامیاں دراصل ایمانیات ہی کے ضعف کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں اور ضعف ایمان کو دور کرنے کے لیے دلیل و برہان کی اہمیت و ضرورت ناقابل انکار ہے۔
(تفصیلی بحث کے لیے ''اساس دین کی تعمیر'' کے باب دوم و سوم کا مطالعہ کیجیے)

ہے، اس لیے نہیں ہے کہ وہ اس راستے کو صداقت کا راستہ مانتا ہی نہیں۔ اس طرح، اور اسی بنا پر، اسے اللہ کے راستے کی طرف بلانے کے معنی بھی وہ نہیں ہیں جو غیر مسلموں کے بلانے کے ہیں، بلکہ صرف یہ ہیں کہ اس کے سوئے ہوئے دینی احساس کو بیدار کیا جائے، اس کے کمزور ایمان میں توانائی لائی جائے، اس کی غفلتوں کو دور کیا جائے، اسے اللہ کی یاد اور آخرت کی فکر دلائی جائے، حسنِ عمل پر ابھارا جائے اور غلط روی کے خطرات سے آگاہ کیا جائے اور یہ سب کچھ ایسے انداز سے، اتنی محبت اور دل سوزی سے، اور اتنے اخلاص وللّٰہیت سے کیا جائے کہ بات دلوں میں اتر جائے۔ یہی طریق دعوت، موعظت حسنہ کا طریق کہلاتا ہے، جسے تحریک اسلامی نے مسلمانوں کے سلسلے میں بنیادی اصول کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔ چنانچہ وہ ان سے جو کچھ کہتی ہے چند لفظوں میں اس کا ماحصل صرف یہ ہے کہ جب تم اپنے کو مسلمان کہتے ہو تو ''مسلمان'' بن کر رہو بھی، اپنے کو اللہ کی مکمل بندگی میں دے دو، اس کے رسول کی غیر مشروط پیروی اختیار کرلو، اپنے ایمان اور اپنے عمل میں مطابقت پیدا کرو، اپنے رویے کو تناقض اور منافقت سے پاک کرلو، اور اس طرح دنیا کی قوموں کے درمیان اسلام کے سچے داعی، دین حق کے بے لاگ گواہ، نیکی کے علم بردار، اور عدل وقسط پر قائم رہنے والے اور اس کے قائم کرنے والے بن کر زندگی گزارو، کہ یہی تمہارا حقیقی موقف، حقیقی منصب اور حقیقی مقصد وجود ہے اور اسی پر تمہاری اخروی فلاح بھی موقوف ہے اور دنیوی بہبود بھی۔[1]

یہاں یہ بات بھی بتا دینے کی ہے کہ اس سلسلے میں تحریک کی ساری کوششیں دین و شریعت کے صرف بنیادی امور اور واضح مطالبات ہی پر مرکوز رہتی ہیں، اس کے تفصیلی احکام اور جزئیات، خصوصاً اختلافی مسائل سے وہ کوئی تعارض نہیں کرتی۔ یہ ایک ایسا طریق کار ہے جس کی حکمت، مصلحت اور معقولیت کسی شرح و بیان کی محتاج نہیں۔ واضح بات ہے کہ پورے دین کی سچی پیروی اس کے بنیادی عقائد کے گہرے شعور و یقین ہی پر اور اس کی بنیادی تعلیمات کی صحیح پیروی ہی پر موقوف ہے، اور شریعت کے تفصیلی احکام کی بجا آوری کا حق اسی وقت ادا ہوسکتا ہے جب یہ شعور بیدار ہو چکا ہو اور یہ پیروی وجود میں آ چکی ہو۔ اس لیے عقل، دینی بصیرت اور دعوتی حکمت سبھی کا تقاضا یہ ہے کہ توجہ صرف انہی بنیادوں کے استحکام پر پوری طرح جمی رہے۔

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھیے ''دعوتِ اسلامی اور اس کے مطالبات''۔

(۳) تیسرا اُصول ’جدال احسن‘ کا ہے۔دعوت کے سلسلے میں جدال احسن کا طریق اس وقت اختیار کیا جاتا ہے جب مخاطب بحث و مناظرہ پر اتر آتا ہے اور دعوت حق کو اور اس کے دلائل کو دلیل ہی کے ذریعے رد کرنے لگتا ہے۔یہ ایک معلوم حقیقت ہے کہ یہ صورت حال کبھی کبھار نہیں، بلکہ اکثر پیش آتی رہنے والی ہے۔کیونکہ اپنے ذہن کے اندر گھرے جمے ہوئے موروثی عقائد و افکار کو یکا یک غلط سمجھ لینا اور ایک ”غیر“ دین کو حق مان لینا عام انسان کے بس کی بات کبھی نہیں رہی ہے۔اس لیے اس دعوت کو پیش کرنے کے لیے چاہے جتنا بھی اچھا، مدلل اور موثر طریقہ اختیار کیا جائے، اس کے جواب میں بحث و مناظرہ اور ردّ و کد کی صورت حال کا پیدا ہوجانا ہر آن متوقع ہے۔ایسی صورت حال کے پیدا ہوجانے پر نہ تو یہ بات صحیح اور مناسب ہوسکتی ہے کہ داعیان حق بھی غیر سنجیدہ مناظرے اور حجت بازی کا جواب ویسے ہی مناظرے اور حجت بازی سے دینا شروع کردیں، اور نہ یہ صحیح اور مناسب ہے کہ وہ مزید افہام و تفہیم سے رک رہیں اور یہ سمجھ لیں کہ کلمۂ حق پہنچانے کی ذمہ داری ہم نے پوری کردی ہے، اب اگر یہ شخص نہیں مانتا تو نہ مانے۔پہلی بات غلط اور نامناسب اس لیے ہوگی کہ وہ نہ تو دعوت حق کے مزاج سے میل کھاتی ہے اور نہ ذہنوں اور دلوں کو متأثر کرسکتی ہے۔متأثر کرنے کی بات تو دور رہی وہ تو انہیں کچھ اور دور ہی کردے گی۔دوسری بات غلط اور نامناسب اس لیے ہوگی کہ وہ ادائے فرض سے کھلا ہوا فرار ہے۔یا پھر دعوتی ذمہ داریوں سے انتہائی بے خبری کا مظہر ہے۔صحیح بات صرف یہ ہے کہ مخاطب کی باتوں اور اس کی دلیلوں کو صبر اور توجہ سے سنا جائے، سن کر اس کے ذہن کی گرہوں کا اندازہ کرلینے کی پوری کوشش کی جائے، اور پھر ان گرہوں کو کھول دینے کی معقول اور کارگر تدبیریں اختیار کی جائیں۔یعنی ایک طرف تو اس کی جوابی بحث میں تلخی، نفسانیت اور دل آزاری کا کوئی عنصر شامل ہو تو اسے پوری عالی ظرفی کے ساتھ نظر انداز کردیا جائے، دوسری طرف اس کی پیش کی ہوئی دلیلوں کی حقیقت، جو ایک باطل عقیدے اور مسلک کی حمایت میں ہونے کے باعث لازماً خود بھی بے جان اور بے مغز ہی ہوں گی، مضبوط اور مؤثر دلائل سے کھول کر رکھ دی جائے، تیسری طرف انداز بحث بھی ممکن حد تک سنجیدہ اور دل آویز ہو، اور نیت میں بھی اخلاص و للٰہیت کا اور ہمدردی و خیر خواہی کا جذبہ محسوس طور پر کام کررہا ہو۔غرض بات سمجھا دینے اور اسے مخاطب کے دل میں اتار دینے کی ہر ممکن تدبیر اور کوشش کی جائے، اور اس سلسلے میں ہر اس امر کا

اہتمام کیا جائے جو مقصد کے حصول میں مددگار بنتا ہو، اور ایسی ہر بات سے احتیاط رکھی جائے جو اس بارے میں کسی جہت سے بھی رکاوٹ بنتی اور مخاطب کو قریب لانے کے بجائے کچھ اور دور ہی کر دینے والی ہو۔ بحث واستدلال اور افہام وتفہیم کے اسی طریقے کا نام 'جدال احسن' ہے، جسے اختیار کرنے کی قرآن حکیم نے ہدایت فرمائی ہے، اور جسے تحریک اسلامی نے ایک مسلمہ بنیادی طریق کی حیثیت سے اختیار کر رکھا ہے۔

'جدال احسن' کی یہ کوشش اس وقت تک جاری رکھی جاتی ہے۔ جب تک کہ مخاطب کے ذہن پر دعوت کی حقانیت روشن نہیں ہو جاتی، یا پھر وہ بحث ومناظرہ کی نچلی سطح سے بھی نیچے نہیں گر جاتا، اور بالکل صاف نظر نہیں آجاتا کہ اب وہ دلیل و برہان کے میدان میں شکست کھا کر دھاندلی، کٹ حجتی، ضد، حمیت جاہلیہ اور مکابرے پر کمربستہ ہو گیا ہے۔ پہلی صورت میں داعی کا مقصد حاصل ہو چکا ہوتا ہے اور دوسری صورت میں افہام وتفہیم کی مزید کوشش کا کوئی فائدہ نہیں رہ جاتا، اس لیے معقولیت اور دعوتی وقار دونوں کا تقاضا یہی ہوتا ہے کہ لَا نَبْتَغِی الْجَاهِلِيْنَ (القصص: ۵۵)، ''ہم جاہلوں کا سا طریقہ اختیار کرنا نہیں چاہتے۔'' کہہ کر اب زبان بند کر لی جائے۔

افادی طریقہ

دعوت کے حقیقی اور اصل طریقے تو یقینی طور پر یہی ہیں جن کی تفصیل ابھی بیان ہوئی اور وہ یہ کہ مخاطب کے سامنے، اس کے حسب حال حکمت یا موعظت حسنہ کے ذریعہ اسلام کی بنیادی تعلیمات اور اس کے واضح مطالبات صاف صاف اور راست طریقے سے پیش کر دیے جائیں اور انھی کو اس کے دل ودماغ میں اتار دینے کی سعی کی جائے، یہاں تک کہ دعوت اپنے حقیقی محرک کے ساتھ اور اپنی صحیح شکل میں اس کے ذہن نشیں ہو جائے، اور اپنی اخروی نجات وکامرانی ہی کو وہ اپنی زندگی کا اصل مسئلہ سمجھ لے ــــــ مگر انسانی ذہن کی رعایت کو بھی بہر حال ایک اہمیت حاصل ہے، اور عقل ودانش کا تقاضا ہے کہ تحریک اسلامی بھی مناسب حدود میں اس اہمیت کو ضرور تسلیم کرے، خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ مخاطب کے ذہن کا مسئلہ آج ایک بڑا مسئلہ بن چکا ہو اور یہ دور ہی مذہبوں اور عقیدوں کے بجائے نظاموں اور ازموں کا دور بنتا جا رہا ہو۔ چنانچہ

صورت واقعہ اس وقت یہ ہے کہ جدید تعلیم یافتہ اور ذہین طبقے کی اکثریت کسی بھی تحریک کو جانچنے پرکھنے کے لیے سب سے پہلے اس کی نظامی صلاحیت کو دیکھتی ہے اور کسی بھی نظام فکر وعمل کی بابت رائے قائم کرنے کے لیے پہلا سوال یہی کرتی ہے کہ وہ دنیا کے موجودہ تمدنی، معاشی اور سیاسی مسائل کا کیا حل پیش کرتا ہے، اور معاملات زندگی کی پیچیدگیوں کو کیسے اور کتنی کامیابی سے سلجھا سکتا ہے؟ حد یہ ہے کہ ان لوگوں سے اگر خدا، آخرت اور نبوت کے بارے میں گفتگو کرنے کی کوشش کی جائے تو وہ کان دھرنے کے لیے بھی آمادہ نہیں ہوتے، اور اگر ہوتے بھی ہیں تو اسی وقت جب آپ انھیں یہ محسوس کرادیں کہ اس دین یا تحریک کے پاس دنیوی مسائل کا بھی ایک اچھا حل موجود ہے۔ کوئی شک نہیں کہ فکر ونظر کی یہ ایک زبردست کجی اور ذہن کا ایک خطرناک فساد ہے، جس میں یہ لوگ مبتلا ہو گئے ہیں۔ لیکن اس کجی اور فساد کی بناء پر اللہ کے ان بندوں کو محروم التفات تو نہیں ٹھہرادیا جاسکتا۔ ایک اسلامی تحریک تو اٹھتی ہی اس لیے ہے کہ بیمار عقلوں کو شفا عطا کی جائے، کج نظری کو راست فکری سے بدل دیا جائے اور خلق خدا کو غلط راہوں سے ہٹا کر سلامتی کی راہ پر لایا جائے۔ وہ صرف راست بازوں ہی کو نہیں ڈھونڈا کرتی۔ بلکہ غلط کاروں پر بھی اپنی نگاہیں جماتی ہے تاکہ انھیں راست باز بنائے۔ اس لیے یہ تحریک بھی ان لوگوں کو ہرگز نظرانداز نہیں کرسکتی جو فکری کجی اور فساد ذہن کے مریض ہیں، اور جب انھیں نظرانداز نہیں کرسکتی تو اس کے لیے انھیں خطاب کرنے کا مناسب حال طریقہ بھی قدرتی طور پر یہی ہوسکتا ہے کہ وہ ان سے گفتگو کا آغاز انہی مسائل سے کرے جو ان کے ذہنوں پر بالفعل چھائے ہوئے ہیں اور جو ان کے نزدیک انسان کا کل یا اصل مسئلہ ہیں، اور پھر اس راستے سے انھیں اپنی اصل دعوت اور حیات انسانی کے حقیقی مسئلے کی طرف لائے۔ یہ صرف عقل اور منطق ہی کا تقاضا نہیں ہے، بلکہ انبیاء علیہم السلام کے طرز عمل میں بھی ہمیں اس کی رہنمائی ملتی ہے۔ قرآن میں ان حضرات کے دعوتی کاموں اور طور طریقوں کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے اپنی دعوت کی ابتداء اَنِ اعْبُدُ و اللّٰہَ ہی کے پیغام اور مطالبے سے ضرور کی تھی، اور اپنا سارا زور بھی توحید و آخرت وغیرہ بنیادی امور ہی پر صرف کیا تھا۔ لیکن ساتھ ہی وہ اپنی بات کی معقولیت، ضرورت، نافعیت اور صداقت کا لوگوں کو قائل بنانے کے لیے بسا اوقات یہ ترغیبی دلیل بھی دیا

کرتے تھے کہ اگر تم اس کلمۂ حق پر ایمان لاؤ گے تو تمہاری آخرت ہی نہیں، بلکہ تمہاری یہ دنیا بھی سنور جائے گی، عزت و اقبال مندی تمہارے قدم چومے گی اور تم پر آسمان سے بھی نعمتوں کی بارش ہوگی اور زمین سے بھی رزق کے خزانے ابلیں گے[1] ظاہر ہے کہ یہ جو کچھ فرمایا جاتا تھا ''مخاطب کے ذہن'' ہی کی رعایت میں فرمایا جاتا تھا۔ یہ ذہن واضح طور پر دنیا پرستی کا ذہن تھا جو کسی بھی چیز کو حق یا باطل اور قابل قبول یا قابل رد ٹھہرانے کے لیے یہ بھی ضرور دیکھتا تھا کہ اس سے اس کے دنیوی مفادات پر کوئی چوٹ تو نہیں لگتی۔ آج یہ ذہنیت چونکہ بہت ترقی کر گئی ہے، اور ترقی کر کے اس حد کو پہنچ گئی ہے کہ مذہبی اندازِ فکر کا کوئی وجود ہی اس کے اندر باقی نہیں رہ گیا ہے اور دنیا اور اس کے معاملات ہی اس کا ذوق و وجدان بن چکے ہیں، جب کہ پہلے کے لوگوں کا حال یہ نہیں تھا کیونکہ وہ شرک اور کفر میں لاکھ مبتلا ہونے کے باوجود کسی نہ کسی شکل میں مذہب کے بھی قائل ہوتے تھے۔ .... اس لیے اب دنیا پرستی کی ذہنیت کی رعایت کا عملی طریقہ بھی کچھ ضرور بدل جانا چاہیے۔ پہلے طریقہ اگر یہ رہا ہے کہ لوگوں کو حق کی اصل دعوت دینے اور دین کے بنیادی حقائق پر عقلی اور فطری دلیلیں پیش کرنے کے بعد دنیوی فلاح کی بھی باتیں کی جاتیں، تو اب یہ ہوگا کہ دعوت کا آغاز ہی انہی باتوں سے کیا جائے، یعنی پہلے ہی قدم پر یہ حقیقت کھول دینے کی سعی کی جائے کہ یہ دین اپنے پاس دنیوی مسائل کا بھی سب سے بہتر حل رکھتا ہے، پھر بتدریج اصل دعوت کو ذہنوں میں اتارنے کی کوشش کی جائے۔ یہ کوشش اور یہ طریقہ یقیناً اسوۂ انبیاء ہی کی پیروی کہلائے گا۔

لیکن جیسا کہ بالبداہت ضروری تھا تحریک اس بارے میں پوری طرح محتاط رہتی ہے کہ فرع، فرع ہی رہے، اصل ہرگز نہ بننے پائے، دعوت پیش کرنے کے اس افادی طریقے کے نتیجے میں ایسا بالکل نہ ہو کہ مخاطب دنیوی مسائل کے حل اور معاشرتی، معاشی اور سیاسی خوش گواریوں کے حصول ہی کو اس تحریک کا اصل مدعا گمان کر بیٹھے۔ یہاں تک کہ وہ اسی جہت سے اس کے قریب بھی آنے لگے۔ وہ اس اہم حقیقت کو ہر وقت نگاہوں کے سامنے رکھتی ہے کہ کوئی دعوت ذہنِ انسانی میں صحیح طور پر نفوذ اسی وقت کر پاتی ہے جب اس کے بنیادی اصول اور حقیقی

---

[1] مثال کے طور پر سورۂ مائدہ کی آیت ۶۶، اور سورۂ نوح کی آیات ۱۱۔۱۲ ملاحظہ ہوں۔

مقاصد اس پر اچھی طرح روشن ہو چکے ہوں، اور دوسری کوئی بھی چیز ان کی اصل نوعیت اور حیثیت پر دھند نہ ڈال رہی ہو۔ اس لیے اگر بعض مواقع پر وہ اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے افادی طریقہ اختیار کرتی ہے تو صرف ایک وقتی ضرورت اور تمہیدی تدبیر ہی کی حیثیت سے اختیار کرتی ہے اور اس بات پر پوری طرح نظر رکھتے ہوئے اختیار کرتی ہے کہ مخاطب کا ذہن دنیوی مسائل کا بہترین حل ہونا ہی اس دعوت کا اصل کمال اور حقیقی وصف نہ سمجھ بیٹھے اور صرف اسی جہت سے اس سے متعارف ہو کر نہ رہ جائے۔ بلکہ اس پر یہ حقیقت اچھی طرح واضح ہو جانی چاہیے کہ دنیوی مسائل کا حل عطا کرنا اور دنیوی فلاح کا باعث بننا اس دعوت کی کامیابی کا صرف ضمنی فیضان ہے، اس کا حقیقی فیضان آخرت کی ابدی زندگی کی سرمدی فلاح ہے۔ تاکہ اگر وہ اس کے قریب آئے تو اسے ٹھیک ٹھیک سمجھ کر ہی قریب آئے، اور اس کے ذہن میں اگر وہ نفوذ کرے تو صحیح اور حقیقی رخ ہی سے نفوذ کرے۔

طریق کار

طریق کار کی اہمیت

کسی بھی تحریک کے مقصد اور نصب العین کے بعد سب سے زیادہ اہمیت اس کے طریق کار کی ہوا کرتی ہے۔ چنانچہ یہ طریق کار اگر نصب العین کے عین مطابق نہ ہو تو تحریک کی راہ لازماً رندھ کر رہ جاتی ہے اور اگر وہ بظاہر آگے بڑھ رہی ہوتی بھی ہے تو اس کا یہ آگے بڑھنا قطعی طور پر ایک ایسے راستے پر ہوتا ہے جو اسے کعبہ کے بجائے کسی ترکستان تک پہنچا دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ تحریکوں کے مقاصد کے بارے میں رائے قائم کرنے کے لیے ان کے کام کے طریقوں کو بھی ضرور دیکھتے ہیں، اور ان کے اعلان کردہ مقاصد کو اس وقت تک ان کے واقعی مقاصد تسلیم نہیں کرتے جب تک کہ ان کا طریق کار بھی اس کی شہادت نہ دے رہا ہو۔ اس لیے یہ ایک مسلمہ ضرورت ہے کہ جیسا نصب العین ہو ٹھیک اسی کے مطابق اس کا طریق کار بھی بنایا جائے۔ آیئے دیکھیں کہ تحریک اسلامی نے اس ضرورت کا کہاں تک لحاظ رکھا ہے اور اپنے نصب العین کے حصول کے لیے اس نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے وہ کیا ہے اور اس نصب العین سے کتنی فطری ہم آہنگی رکھتا ہے؟

طریق کار کی بنیاد، کتاب وسنت

تحریک اسلامی نے اپنا طریق کار متعین کرنے کے لیے جن چیزوں کو سامنے رکھا ہے ان میں سب سے اہم، بنیادی اور فیصلہ کن حیثیت صرف دو چیزوں کو حاصل ہے: ایک تو قرآنی

ہدایات کو، دوسرے سنت رسول اور اسوۂ انبیاء کو۔ بالکل صحیح ہوگا اگر کہا جائے کہ انہیں دو چیزوں کی پیروی اور پابندی اس کا کل طریقۂ کار ہے، اور باقی جو چیزیں ہیں ان سب کی حیثیت تابع اور ذیلی امور کی ہے۔ چنانچہ اس کے دستور میں طریق کار کی بحث شروع ہی ان الفاظ سے ہوتی ہے۔

> ''قرآن اور سنت جماعت (یعنی تحریک اسلامی) کی اساس کار ہوں گی، دوسری ساری چیزیں ثانوی حیثیت سے صرف اس حد تک پیش نظر رکھی جائیں گی جس حد تک قرآن اور سنت کی رو سے ان کی گنجائش ہو۔'' (ص: ۸)

یہ الفاظ اپنے مفہوم میں آئینے سے بھی زیادہ روشن ہیں۔ کتاب وسنت جماعت کی اساس کار ہوں گی، کہہ دینے کے بعد حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہ جاتا کہ اس تحریک کی زمام کار کلیۃً انھیں دونوں چیزوں کے ہاتھ میں ہے اور رہے گی۔ اس کے طریق کار میں کوئی ایسی بات ہرگز نہ پائی جا سکے گی جس کی ہدایت یا اجازت اللہ کی کتاب سے یا اس کے رسول کے اسوے سے نہ مل رہی ہو، چاہے اسے زمانے میں کتنا ہی قبول عام کیوں نہ حاصل ہو، اور اس پر حسن تدبیر کی مہر ہی کیوں نہ لگی ہو۔ وہ ہر حال میں صرف انہی خطوط پر گامزن رہے گی جو کتاب وسنت کے مقرر کیے ہوئے ہیں، یا جن پر چلنے سے ان کے کسی ارشاد کی خلاف ورزی نہ لازم آتی ہو۔ اس کی وجہ اتنی واضح ہے کہ کسی بھی صاحب نظر پر مخفی نہیں ہو سکتی۔ جب یہ تحریک ایک اسلامی تحریک ہے اور اس کا نصب العین کسی فکر کا نہیں، بلکہ کتاب وسنت کا مقرر کیا ہوا ہے، تو عقلی اور منطقی طور پر اس کا طریق کار بھی لازماً کتاب وسنت ہی کا مقرر کیا ہوا ہونا چاہیے۔ کتاب اور سنت ہی کا نام تو اسلام ہے۔ اس لیے کسی بھی ایسے کام کا طریقہ جو صحیح معنوں میں اسلامی ہو، ان سے آزاد ہو کر اپنایا ہی نہیں جا سکتا۔ خصوصاً وہ اسلامی کام جو اسلام کے کسی ایک آدھ جزو کی خدمت ونصرت کا نہیں، بلکہ پورے کے پورے اسلام کی نصرت اور اقامت کا کام ہو، اس کے سلسلے میں تو ایسی کسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ کتاب الٰہی تو خود اصل تحریک اسلامی ہی کی کتاب ہے، اور اس کا تدریجی نزول اس کے مختلف مراحل کے ساتھ ساتھ، اور ان کے عملی تقاضوں کی مناسبت ہی سے ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اندر پائے جانے والے طریق کار سے بہتر اور مناسب تر کوئی دوسرا طریق کار ممکن ہو ہی نہیں سکتا۔ یہی حال سنت اور اسوۂ انبیاء کا بھی ہے، جو واضح طور پر دعوت دین ہی کی عملی سرگزشت ہے۔ اس لیے دعوت اسلامی کا طریق کار معلوم کرنے کے لیے ہر طرح یہ بات ضروری

بھی ہوگی اور کافی بھی، کہ اس دعوت کے اصل داعیوں اور علم برداروں کے طور وطریقے دیکھ لیے جائیں، پس اس دعوت کا طریق کار بنیادی طور پر پہلے ہی سے طے شدہ اور متعین ہے، اسے طے اور متعین کرنا نہیں ہے۔

بظاہر یہ ایک جامد اور دقیانوسی اندازِ فکر ہے، مگر حقیقت میں ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلاشبہ اگر معاملہ کسی دوسری تحریک کا ہوتا تو حقیقت یوں ہی قرار پاتی، مگر ایک اسلامی تحریک کو بہت سی دوسری چیزوں کی طرح اس معاملے میں بھی دوسری تحریکوں پر ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا۔ دوسری تحریکوں کے لیے ہزاروں سال پرانے طور وطریق ضرور باعث جمود اور پیام موت ثابت ہوسکتے ہیں۔ لیکن اسلامی تحریکوں کے لیے یہی قدامت پسندی عین جدت، عین حرکت اور عین زندگی ہے۔ کیونکہ ان تحریکوں کا نصب العین، ان کا مزاج، ان کا مفاد، ہر چیز یہی چاہتی ہے کہ وہ اپنا طریق کار لازماً وہی رکھیں جو انبیائی دعوتوں کا ہمیشہ رہا ہے اور جو ان کی فطرت کا عین تقاضا تھا۔ اسی کے اندر ان کی زندگی کا راز پنہاں ہوتا ہے، وہی انھیں متحرک رکھ سکتا اور صحیح منزل کی طرف لے جاسکتا ہے۔ اس لیے آج کی تحریک ودعوت اسلامی کے لیے بھی وہ ایک جدید اور حرکی طریق کار ہے، اسی پر اس کی کامیابی موقوف ہے، اور اس لیے ہر حال میں اسی پر قائم رہنا اس کے لیے قطعی ضروری ہے۔

اخلاق اور دیانتداری کا التزام

اس بنیادی شے کے بعد تحریک کے طریق کار میں دوسری جس چیز کو اصول کی حیثیت حاصل ہے وہ راستی، اخلاق اور دیانت کا دامن مضبوطی سے تھامے رہنے کی روش ہے، جیسا کہ اس کا دستور قطعیت سے کہتا ہے:

> ''جماعت اپنے تمام کاموں میں اخلاقی حدود کی پابند ہوگی، اور کبھی ایسے ذرائع اور طریقے اختیار نہ کرے گی جو صداقت و دیانت کے خلاف ہوں۔'' (ص: ۹)

یہ پابندی اس لیے بھی ضروری ہے کہ کتاب وسنت نے اس کی انتہائی تاکید کی ہے، اس لیے بھی کہ اس دعوت کا فطری مزاج اسی کا طالب ہے، اور اس لیے بھی کہ یہی وہ ہتھیار ہے جس سے یہ تحریک اپنی لڑائی لڑسکتی ہے اور اس کے پھیلے ہوئے محاذوں پر کامیابی حاصل کرسکتی

ہے۔ کیونکہ اپنی منزل کی طرف بڑھنے میں اسے جن طاقتوں سے لازماً پنجہ آزما ہونا ہے، وہ دولت اقتدار، عوامی مقبولیت اور نشر واشاعت، غرض ہر طرح کے مادی سروسامان سے لیس ہیں، جب کہ اس کے پاس ان میں سے کوئی ایک چیز بھی موجود نہیں اور اس کا سارا انحصار صرف اپنی اخلاقی طاقت ہی پر ہے۔ اب اگر وہ اس طاقت سے بھی اپنے کو محروم کر لیتی ہے تو پھر اپنی حریف قوتوں کا مقابلہ آخر کس طرح کر سکے گی؟ مقابلہ کر سکنے کی بات تو الگ رہی، اس حالت میں تو اسے اسلامی دعوت یا تحریک کہنا بھی اسلام کو رسوا کرنا ہوگا۔ وہ ایک اسلامی تحریک تو ہے ہی صرف اس بنا پر کہ اس نے دنیا میں حق وصداقت کا بول بالا کرنا اپنا مقصود قرار دے رکھا ہے۔ اس لیے خود اپنے طرز عمل سے اگر وہ اسی حق وصداقت کو آئے دن پامال کرتی رہے تو سب کچھ ہو سکتی ہے مگر اسلامی دعوت وتحریک کسی حال میں نہیں ہو سکتی۔ یہ طرز عمل تو اس کے دعوے ہی کی نہیں، اس کے وجود تک کی علانیہ نفی کرنے والا ہوگا۔

اس تفصیل سے واضح ہو گیا ہوگا کہ اخلاق کے تقاضوں اور دیانت کے اصولوں کی پابندی تحریک نے کسی سیاسی ضرورت یا کسی وقتی مصلحت کے تحت اختیار نہیں کر رکھی ہے، بلکہ اقامت دین کا ضروری تقاضا اور اپنا لازمی مدار حیات سمجھ کر اختیار کر رکھی ہے۔ اس لیے کسی بھی وقت اسے پس پشت ڈال دیے جانے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔

پرامن اور تعمیری روش

تحریک کے طریق کار کا تیسرا نکتہ یہ ہے کہ اس کی ساری عملی سرگرمیاں پرامن اور خالص تعمیری ہوں گی، تخریب کاری اور تشدد پسندی سے یہ قطعاً دور رہے گی۔ چنانچہ اس کے دستور کا واضح اعلان ہے کہ:

> ''جماعت اپنے نصب العین کے حصول کے لیے تعمیری اور پرامن طریقے اختیار کرے گی۔'' (ص: ۹)

اس اصول کے پیچھے جو ضرورت اور مصلحت کام کر رہی ہے وہ بھی نظروں کے سامنے کی چیز ہے۔ ایک اسلامی تحریک کا مزاج پہچاننے اور اس کے صحیح مفاد سے واقفیت رکھنے والا کوئی بھی شخص اس حقیقت سے بے خبر نہیں رہ سکتا کہ پرامن اور تعمیری روش اس کی ایک بنیادی ضرورت

ہوتی ہے، جس کے بغیر اس کے لیے کامیابی کی راہ کھل ہی نہیں سکتی۔ کیونکہ یہ راہ جسموں کی جبری محکومی سے نہیں، بلکہ دلوں کی رضامندانہ آمادگی سے کھلا کرتی ہے اور ظاہر ہے کہ دلوں کو آمادہ کرنے والی چیز سنجیدہ، پرامن اور تعمیری جدوجہد ہی ہوسکتی ہے اور اس کے لیے ماحول کا پرسکون ہونا بھی ضروری ہے۔ اب اگر تحریک خود ہی پرامن رویہ اختیار نہیں کرتی اور تخریب یا جبر وتشدد کی بھی روادار بن جاتی ہے، تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ یہ خود اپنے ہاتھوں فضا کو زہر آلود بنا رہی ہے اور اپنے راستے میں خود کانٹے بو رہی ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی کے لیے بالکل ناگزیر ہے کہ وہ اپنے طور طریقے لازماً پرامن اور تعمیری ہی رکھے۔[1]

بلاشبہ یہ بھی ایک واقعہ ہے کہ بعض انبیائی دعوتوں کو ایک وقت چل کر دین کے دشمنوں سے جنگ بھی کرنی پڑی ہے، اور خود دعوت محمدی کو بھی یہ مرحلہ پیش آیا تھا۔ اس کے معنی یقیناً یہی ہوں گے کہ ''پرامن اور تعمیری رویہ'' اپنائے رکھنے کے باوجود ایک اسلامی تحریک جنگ و جدال کے مرحلے سے بھی گزر سکتی ہے۔ لیکن یاد رکھنا چاہیے کہ اس مرحلے سے گزرنا اصلاً اور ہر حال میں لازمی نہیں ہے، بلکہ قطعی طور پر ایک مخصوص حالت کے پیش آجانے اور چند متعینہ شرطوں

---

[1] اس سلسلے میں نامناسب نہ ہوگا اگر یہاں ایک دل چسپ مگر انتہائی افسوس ناک صورت واقعہ کا بھی تذکرہ کر دیا جائے۔ گزشتہ بیس برسوں میں حکومت نے تحریک اسلامی کے خلاف متعدد اقدامات کیے ہیں۔ مثلاً اس کے ذمہ داروں اور کارکنوں کو برابر گرفتار اور نظر بند کرتی رہی ہے، اس کے خلاف اپنے مختلف محکموں میں خفیہ سرکلر جاری کرتی رہی ہے، اس کے ارکان کو اپنی ملازمتوں سے نکالتی رہی ہے، اور اس کے ذمہ دار وزراء اس کے مخالفت میں بیان دیتے رہے ہیں، اور تقریباً ہر مرتبہ اور ہر اقدام کے موقع پر اپنی بیان کردہ فرد قرارداد جرم میں اس نے تخریب کاری کا الزام بھی اس پر ضرور لگایا۔ لیکن آج تک اپنے کسی ایک اقدام کے سلسلے میں بھی وہ ملک کے عام قوانین کا سہارا لینے کی جرأت نہیں کرسکی، کیونکہ اسے یقین تھا کہ خود اپنی ہی عدالت میں بھی اس الزام کو ثابت کرنا ممکن نہ ہوسکے گا۔ اسی طرح جب کسی اسمبلی میں یا کسی پریس کانفرنس میں اربابِ حکومت سے ان گرفتاریوں کے متعلق سوالات کیے گئے تو وہاں بھی انہوں نے اسی الزام کو دہرادیا، مگر جب اس کے لیے واقعات کی شہادت طلب کی گئی تو آج تک کسی بھی وزیر اعظم یا وزیر اعلیٰ یا وزیر داخلہ کی طرف سے کوئی ایک واقعہ بھی ثبوت میں پیش نہ کیا جاسکا۔ حد یہ ہے کہ جب ایک بار یوپی اسمبلی میں ایک ممبر نے اصرار کے ساتھ پوچھا کہ کیا جماعت اسلامی کی اب تک کی تاریخ میں کسی تخریبی کاروائی کی نشان دہی کی جاسکتی ہے تو وزیر داخلہ نے، جو افسوس ہے کہ صرف سیاست کار اور وزیر ہی نہیں تھے، بلکہ ایک بڑی دھارمک شخصیت کے بھی مالک تھے، یہ کہہ کر اپنی جان چھڑا لینے میں کوئی اخلاقی قباحت یا ضمیر کی خلش محسوس نہیں کی کہ:

''مجھے یہ تاریخ یاد نہیں۔''

کے پوری ہو سکنے پر موقوف ہے۔ یہ مخصوص حالت اس وقت ظہور میں آتی ہے جب مخالف طاقت تحریک کو اپنا کام کرنے کے حق سے محروم کر دیتی ہے اور اس کے خلاف تشدد، ظلم اور بربریت پر اتر آتی ہے۔ اسی طرح متعینہ شرطوں میں سے ایک اہم شرط یہ بھی ہے کہ داعی گروہ اہل ملک کے سامنے اپنی دعوتی ذمہ داریاں پوری کر کے یا حالات سے بالکل مجبور ہو کر کسی اور جگہ ہجرت کر گیا ہو۔ صرف انہی دو باتوں کو اگر سامنے رکھ لیا جائے تو تحریک اسلامی ہند کا معاملہ بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ اس کی جدوجہد کا طریقہ شروع سے آخر تک پر امن ہی رہے گا، جنگ و جدال کے مرحلے سے وہ دوچار ہی نہ ہوگی۔ یہ اس لیے کہ وہ ایک ایسے ملک میں کام کر رہی ہے جہاں کا دستور اپنے ہر باشندے کو عقیدہ و مسلک ہی کی نہیں، بلکہ اس کی تبلیغ واشاعت اور تنظیم کی بھی معقول حد تک آزادی دیتا ہے۔ اس لیے اس کے سلسلے میں ہجرت اور جنگ و جہاد کا مسئلہ ہی بحث سے خارج ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس نے شروع ہی میں اس اہم نکتے کو اچھی طرح واضح کر دیا تھا، اور دعوت دین کے مراحل کی تفصیل اصولی حیثیت سے بیان کر دینے کے بعد، کہ اس کا پہلا مرحلہ دعوت و تبلیغ کا ہے، دوسرا ہجرت کا اور تیسرا جنگ و جہاد کا، یہ صراحت بھی کر دی تھی کہ:

> ''ہر دعوت کو کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے لیے ان تینوں مراحل سے گزرنا لازمی نہیں ہے۔ مقصود صرف یہ ہے کہ عام طور پر تینوں مرحلے پیش آتے ہیں۔ ورنہ اس جمہوریت کے زمانے میں اس بات کا بھی امکان ہے کہ صرف پہلا مرحلہ ہی دعوت کو کامیابی سے ہم کنار کر دے۔'' (دعوت دین ص:۴۴-۴۷)

فرقہ پرستی اور طبقاتی کش مکش سے اجتناب

چوتھی بات یہ کہ تحریک کے طور طریقوں میں جس طرح تشدد پسندی اور تخریب کاری کے لیے کوئی جگہ نہیں، اسی طرح ایسی باتوں کی بھی کوئی گنجائش نہیں جن سے فرقہ وارانہ تلخی یا طبقاتی کش مکش یا کسی اور طرح کی کشیدگی پیدا ہوتی ہو۔ اس کا دستور واضح طور سے کہتا ہے کہ:

> ''............کبھی ایسے ذرائع اور طریقے استعمال نہ کرے گی ....جن سے فرقہ وارانہ منافرت، طبقاتی کش مکش اور فساد فی الارض رونما ہو۔'' (ص : ۹)

اس بات کی ضرورت اور مصلحت بھی ٹھیک وہی ہے جو اوپر کی بحث میں ابھی بیان ہوئی ہے۔ تحریک کا نہ تو مزاج ہی اس امر کو گوارا کرتا ہے اور نہ اس کا مفاد ہی اس کی اجازت دیتا

ہے کہ وہ باشندگان ملک میں کوئی فرقہ وارانہ اور قوم پرستانہ کش مکش پیدا کرے، یا گروہی منافرت، لسانی عناد اور علاقائی تعصب کی آگ بھڑکائے، یا طبقاتی کشیدگی کو ہوا دے، فساد انگیزی سے کام لے۔ بلا شبہ یہی سب حرکتیں آج کل عام تحریکوں کا مدار حیات بنی ہوئی ہیں۔ لیکن اس بار بار دہرائے ہوئے امر واقعی کو یہاں پھر یاد کیجیے کہ ایک اسلامی تحریک دوسری تمام تحریکوں سے اپنے مقصد، اپنے اصول، اپنے معیارات اور اپنے مزاج، ہر چیز میں بالکل مختلف ہوتی ہے۔ اس لیے اسے کم از کم بنیادی مسائل میں ان پر قیاس کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا۔ کتنی ہی چیزیں ہیں جو ان کے لیے تو آب حیات ثابت ہوتی ہیں، لیکن اس کے حق میں زہر ہلاہل کا حکم رکھتی ہیں۔ چنانچہ ان مذکورہ بالا کشیدگیوں اور منافرتوں کا بھی یہی حال ہے۔ دوسری تحریکوں کے لیے اگر وہ قبولیت اور ترقی کے دروازے کھول دینے والی ہیں تو اس تحریک کے لیے راستے کی بھاری اور ناقابل عبور چٹانوں سے کم نہیں ہیں۔ اگر تحریک اسلامی اللہ کے سارے بندوں کو اس کی سچی بندگی کی راہ پر لانا چاہتی ہے تو غور کیجیے کہ ان منافرتوں اور کشیدگیوں کو ہوا دے کر وہ اپنے اس مقصد کی کون سی خدمت انجام دے سکے گی؟ کیا ایسی کسی ذہنی اور جذباتی کشاکش کی فضا میں غیر مسلم کسی طرح بھی اس کی آواز پر کان دھرنے کے لیے تیار ہو سکیں گے؟ غیر مسلموں کو بھی چھوڑیئے کیا خود مسلمانوں کی بھی ذہنی کیفیت ان منافرتوں اور کشیدگیوں کے نتیجے میں ایسی نہ ہو جائے گی، جسے اپنے قومی اور گروہی مفادات تو عزیز سے عزیز تر ہوں، مگر دین کی سچی پیروی اور اسلام کی دعوت و اقامت اس کے لیے بے مزا اور گراں بن کر رہ گئی ہو؟

جب نتیجہ کے اعتبار سے صورت واقعہ یہ ہے تو اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ دعوت اسلامی فرقہ وارانہ منافرت اور لسانی یا طبقاتی کشیدگیوں کی سوچ بھی نہیں سکتی۔ اگر سوچے گی تو اس کا مطلب صرف یہ ہوگا کہ اپنا گلا خود گھونٹ لینا چاہتی ہے۔

تبلیغ و تلقین پر انحصار

طریق کار کا آخری اہم اصول یہ ہے کہ تحریک اپنی دعوتی جدو جہد کا سارا انحصار اپنے پیغام کی نشر و اشاعت، اپنے نصب العین کی مؤثر تبلیغ و تلقین اور اپنے اصول و افکار کی مدلل توضیح و تفہیم پر رکھے گی۔ اس کی دعوتی سرگرمیاں اس کے سوا اور کچھ نہ ہوں گی کہ حکمت و استدلال اور

موعظت حسنہ سے کام لے، افہام وتفہیم کے ذریعہ دماغوں میں نفوذ کرے، دین حق کی صداقت دلوں میں اتارے اور پھر ذہنوں کی اصلاح کر کے اور سیرتوں کو سنوار کر لوگوں کو اپنا ہم سفر بنائے۔ اس کے دستور کے ان الفاظ پر نظر ڈالیے:

> ''وہ تبلیغ وتلقین اور اشاعت افکار کے ذریعے ذہنوں اور سیرتوں کی اصلاح کرے گی، اور اس طرح ملک کی اجتماعی زندگی میں مطلوبہ صالح انقلاب لانے کے لیے رائے عامہ کی تربیت کرے گی۔'' (ص : ۹)

طریق کار کے جو اصولی نکات پہلے بیان کیے جا چکے ہیں یہ اصول دراصل انہی کا ناگزیر منطقی نتیجہ ہے۔ تحریک جب ہر حال میں اخلاقی حدود کی پابند ہے، جب راستی اور دیانت اس کی بنیادی ضرورت ہے، جب تخریب اور تشدد سے، سازش اور فریب سے، ہنگامہ آرائی اور فساد انگیزی سے، گروہی منافرت اور قومی وطبقاتی کش مکش سے اس کا مزاج اور مفاد دونوں ابا کرتے ہیں، جب ماحول کے امن وسکون کی وہ فطری پیاس رکھتی ہے اور جب پرامن تعمیری طریقہ ہی اسے راس آ سکتا ہے تو عملاً اس کا مطلب اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ اقامت دین کی جدوجہد کا وہ راستہ جو اسے منزل مقصود کی طرف صحیح سمت پر لے جا سکتا ہے اور آگے بڑھا سکتا ہے، حکیمانہ تبلیغ وتلقین اور مدلل ومؤثر افہام وتفہیم ہی کا راستہ ہو سکتا ہے، اس کے سوا اور سارے راستے اس کے لیے قطعی بند ہیں۔

جماعتی نظام

جماعتی نظام کی ضرورت

ہمہ گیر دعوت وتحریک کے تصور کے ساتھ اجتماعیت اور نظم وضبط کا تصور بالکل لازم ملزوم سا ہے۔ آپ دنیا کی پوری تاریخ میں کوئی ایک مثال بھی ایسی نہیں پاسکتے کہ کوئی تحریک ایک ہمہ گیر قسم کے انقلابی نصب العین کو لے کر اٹھی ہو اور کسی ٹھوس اجتماعیت کے بغیر کامیابی کی منزل تک پہنچ گئی ہو۔ 'تحریک و دعوت اسلامی' جیسا کہ تفصیل سے معلوم ہو چکا، ایک ہمہ گیر نوعیت ہی کی تحریک ہے، بلکہ ایسی اور اتنی ہمہ گیر نوعیت کی تحریک ہے کہ اپنی ہمہ گیری میں بھی اپنی مثال آپ ہی ہے۔ چنانچہ اس کا نصب العین دنیا کے صرف معاشی یا سیاسی ڈھانچے ہی کو نہیں، بلکہ پوری انسانی زندگی کو بدل دینے اور بدل کر ایک نئے سانچے میں ڈھال دینے کا نصب العین ہے۔ اس کا مقصد افراد کی اصلاح بھی ہے، معاشرے کی جدید تعمیر بھی اور ریاست کی نئی تشکیل بھی۔ وہ عقائد وافکار کی، سیرت وکردار کی، خیر وشر کے معیار کی، تمدنی، معاشی اور سیاسی اصول وضوابط کی، غرض انسان اور انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کی کایا پلٹ دینا چاہتی ہے، جس کے لیے اسے قدرتی اور بدیہی طور پر ہمہ جہتی مثبت کوششوں کے ساتھ ساتھ ہمہ جہتی منفی کوششیں بھی انجام دینی ہیں۔ ایک طرف تو بندگان خدا کو اپنی دعوت پہنچانا، ان کے دلوں اور دماغوں میں اس کی حقانیت اور ضرورت کو اتارنا، انھیں اپنی صفوں میں لا کھڑا کرنا، ان کی فکری وعملی تربیت کرنا اور پھر انھیں بھی اپنی دعوتی جدوجہد میں لگائے رہنا ہے، دوسری طرف لوگوں کے ذہنوں میں جمے ہوئے غلط افکار وعقائد ہی کو نہیں، بلکہ ملک کی اجتماعی زندگی پر چھائے ہوئے طاقت ور نظام باطل کو بھی

جڑ سے اکھاڑ پھینکنا ہے، تا کہ اسلامی نظام کے قیام کے لیے جگہ خالی ہو سکے۔ اتنے بھاری، اتنے وسیع، اتنے بڑے اور اتنے دشوار و صبر آزما کام پر نظر پڑتے ہی عقل عام بے ساختہ پکار اٹھے گی کہ اگر دوسری تحریکوں کے لیے کامیابی ایک مضبوط اجتماعیت اور مستحکم نظم و ضبط کے بغیر محال ہے، تو اس تحریک کے لیے محال تر ہے۔ بڑی سادہ لوحی کی بات ہوگی اگر یہ خیال کر لیا جائے کہ ایسی غیر معمولی اور ہمہ گیری رکھنے والی تحریک محض افراد کی بھیڑ اکٹھی کر کے اپنے مقاصد میں کامیاب ہو سکتی ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی نے بالکل بجا طور پر عقل اور تاریخی تجربے کے اس تقاضے کو پوری پوری اہمیت دی، اور اپنے کام کے لیے ایک ٹھوس اور کارگر اجتماعی نظم پہلے دن سے قائم کر لینا ضروری سمجھا۔

پھر یہ صرف ایک عقلی اور تجرباتی ضرورت ہی نہیں تھی، بلکہ اس سے آگے بڑھ کر ایک دینی ضرورت بھی تھی اور وہ اس لیے کہ یہ تحریک جن انبیائی دعوتوں کا ایک 'پرتو' ہے اور جن کے نقوش قدم کی پیروی اس کا ایک بنیادی اصول اور لازمی فریضہ ہے، ان سب کے یہاں منظّم اجتماعیت موجود تھی اور انتہائی معنوں میں موجود تھی۔ یہ اور بات ہے کہ اس اجتماعیت کا ڈھانچہ اور اس کے ظاہری رسوم و ضوابط وہ نہیں تھے جن کا آج کل چلن ہے۔ مگر جہاں تک نظم و اجتماعیت کی حقیقی روح کا تعلق ہے، یہ وہاں نہ صرف یہ کہ بالبداہت موجود تھی بلکہ کمال کی اس حد تک موجود تھی جس کا آج کی رسموں اور ضابطوں کی عادی دنیا تصور بھی نہیں کر سکتی۔ چنانچہ ان دعوتوں پر لبیک کہنے والے تسبیح کے دانوں کی طرح باہم ایک ہی رشتے میں انتہائی مضبوطی سے پروئے ہوئے رہتے تھے، اور اپنے امام و رہنما کے اشاروں کے مطابق ہی کرتے تھے جو کچھ کرتے تھے۔ ان کی نظریں ہمیشہ ان کے ارشادات ہی پر جمی رہا کرتی تھیں۔ وہ اپنے اس مرکز سے پوری طرح وابستہ رہتے اور اپنی رایوں، خواہشوں اور قوتوں کو اس کی ہدایتوں کی مکمل پابندی میں دیے رہتے تھے۔ تا کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق ان سے جب اور جو چاہے کام لے۔[1] اگر اس صورت واقعہ کا نام نظم و اجتماعیت نہیں ہے تو کہنا چاہیے کہ اس دنیا میں نظم و اجتماعیت نام کی کوئی چیز کبھی پائی ہی نہیں گئی۔

اس کے علاوہ نظم اجتماعی کے ایک دینی ضرورت ہونے پر ایک اور پہلو سے بھی غور کیجیے یہ تحریک جس دین کی اقامت کرنا چاہتی ہے، اس کا مزاج اتنا اجتماعیت پسند واقع ہوا ہے کہ اس کی

---

[1] تفصیل کے لیے ''اسلام اور اجتماعیت'' کا مطالعہ کیجیے۔

بنیادی عبادتیں بھی اجتماعیت کی روح اور اس کے مظاہر، دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہیں۔ حد یہ ہے کہ وہ اجتماعی نظم کے بغیر دو آدمیوں کا ایک ساتھ سفر کرنا بھی گوارا نہیں کرتا۔ غرض 'دین' کا کام ہو یا دنیا کا، اس کے اندر اگر اجتماعیت کی شان پیدا ہونے کا ذرا بھی عملی امکان ہوتا ہے تو اسلام اسے ملحوظ رکھنے کا حکم ضرور دیتا ہے۔[۱] جب حقیقت واقعی یہ ہے تو یہ بات کسی طرح بھی نہیں مانی جاسکتی کہ 'اقامت دین' جیسے عظیم ترین کام کے سلسلے میں نظم و اجتماعیت کے تقاضے نظر انداز کردیے جاسکتے ہیں اور دین اسے روا رکھ سکتا ہے۔ یہاں تو جو بات مانی جاسکتی ہے، وہ صرف یہی ہے کہ اس کام کے لیے نظم اجتماعی انتہائی حد تک مطلوب ہے، اور جتنا بڑا یہ کام ہے اسی کی مناسبت سے اجتماعیت کے اعلیٰ تقاضے بھی اس کے سلسلے میں ملحوظ رکھنے ضروری ہیں۔

ان مختلف وجوہ سے تحریک اسلامی نے ایک مضبوط جماعتی نظام کے قیام کو اپنے لیے ناگزیر قرار دے رکھا ہے۔

عملی شکل

تحریک نے اپنا جو جماعتی نظام قائم کر رکھا ہے اس کی ضروری تفصیل یہ ہے:

(۱) تحریک کی رکنیت

اس کے جماعتی نظم کی رکنیت (ممبری) کا دروازہ ہر ہندوستانی شہری کے لیے کھلا ہوا ہے۔ اس بارے میں اس کے دستور کا اعلان سنیے:

> ''انڈین یونین کا ہر شہری، خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اور خواہ وہ کسی قوم یا نسل سے تعلق رکھتا ہو، جماعت اسلامی ہند کا رکن بن سکتا ہے۔'' (ص : ۱۰)

لیکن ظاہر ہے کہ کوئی بھی تحریک یا تنظیم کسی شرط کے بغیر لوگوں کو اپنا ممبر نہیں بنایا کرتی، بلکہ اس شرط کے ساتھ بنایا کرتی ہے کہ لوگ اس کے مقاصد اور افکار سے اتفاق کا اظہار کریں اس لیے قدرتی طور پر یہ تحریک بھی صرف اسی شخص کو اپنا ممبر بناتی ہے جو اس کی ان شرائط کو پورا کرے:

(الف) عقیدہ لا الٰہ الّا اللّٰہ محمد رسول اللّٰہ کو اس کی تشریح (مذکورہ دفعہ: ۳) کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد شہادت دے کہ یہی اس کا عقیدہ ہے۔

---

[۱] تفصیل کے لیے ''اسلام اور اجتماعیت'' کا مطالعہ کیجیے۔

(ب) جماعت کے نصب العین کو اس کی تشریح (مذکورہ دفعہ:۴) کے ساتھ سمجھ لینے کے بعد اقرار کرے کہ یہی اس کا نصب العین ہے۔

(ج) جماعت کے طریق کار (مذکورہ دفعہ:۵) کی پابندی کا اقرار کرے۔

(د) دستور جماعت کو سمجھ لینے کے بعد عہد کرے کہ وہ اس دستور کی اور اس کے مطابق نظم جماعت کی پابندی کرے گا۔ (ص: ۱۰)

جو شخص یہ شرط پوری کر دیتا ہے اور پوری کر کے اپنے کو رکنیت کے لیے پیش کرتا ہے وہ رکن بنا لیا جاتا ہے، بشرط کہ تحریک کے مرکزی ذمہ دار کو آثار وقرائن سے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ شخص اپنے قول وقرار میں سچا اور اپنی پیش کش میں مخلص ہے۔ اس طرح اس معاملے میں بھی اس کا طریقہ عام تحریکوں سے بہت کچھ مختلف ہے، جن کے یہاں کسی کو پارٹی ممبر بنانے کے لیے اس کی صداقت و دیانت اور سیرت و کردار کا کیا سوال، بسا اوقات اس بات کی بھی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی کہ وہ پارٹی کے اصول وقواعد ہی سے اتفاق کا اظہار کر چکا ہو، بس دس بیس پیسوں کی ممبری فیس کافی سمجھ لی جاتی ہے، جب کہ اس تحریک کی ممبری فیس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہوتی، مگر نصب العین پر یقین، اصول پر اطمینان، مقاصد سے عملی وابستگی، ایمانی جذبہ، باطنی اخلاص، ذہنی یکسوئی، سیرت کی بلندی اور عمل کی پاکیزگی لازماً درکار ہوتی ہے۔ حتیٰ کہ جب تک ان صفات کا ثبوت امیدوار رکنیت کے رویے سے نہیں مل جاتا اور یہ اطمینان نہیں ہو جاتا کہ یہ شخص فی الواقع ہر طرف سے یکسو ہو کر، فکری و عملی ہر حیثیت سے، اس دعوت کو اپنا چکا ہے، اسے جماعتی نظام میں داخل نہیں کیا جاتا، اور پھر داخل کر لیے جانے کے بعد بھی اس بات پر نظر رکھی جاتی ہے کہ اس کے بارے میں خود یہ اطمینان بھی اپنی جگہ قابل اطمینان تھا یا نہیں، جس کا اندازہ چند عملی ذمہ داریوں سے لگایا جاتا ہے۔ یہ ذمہ داریاں مبہم یا مجمل نہیں رکھی گئی ہیں، بلکہ ان کی پوری تعیین اور وضاحت کر دی گئی ہے اور دستور کے اندر کر دی گئی ہے، جو اس طرح ہے:

ہر رکن جماعت کے لیے لازم ہوگا کہ:

(۱) دین کے جملہ فرائض کو ان کی شرعی پابندیوں کے ساتھ ادا کرے۔

(۲) کبائر سے اجتناب کرے، اور اگر وقتی جذبات نفس سے مغلوب ہو کر کسی کبیرہ کا مرتکب ہو جائے تو اس سے توبہ کرے۔

(۳) اگر وہ کوئی ایسا ذریعہ معاش رکھتا ہو جو معصیت فاحشہ کی تعریف میں آتا ہے تو اسے ترک کردے، بلا لحاظ اس کے کہ اس کے ترک کرنے سے کتنا نقصان ہوتا ہے اور اگر اس کے ذرائع معاش میں اس طرح کے کسی ذریعہ کا کچھ حصہ شامل ہو تو اس حصے سے اپنی معیشت کو پاک کرلے۔

(۴) اگر اس کے قبضے میں ایسا مال یا جائداد ہو جو حرام طریقے سے حاصل کیا گیا ہو تو اس سے دست بردار ہو جائے، لیکن اگر وہ مال یا جائداد معلوم و متعین نہ ہو تو توبہ و استغفار کے ساتھ تلافی کی ممکن کوشش کرے۔

(۵) اگر اس کے مال یا جائداد میں کسی حق دار کا تلف کردہ کوئی حق شامل ہو تو اسے اس کا حق پہنچا دے۔ یہ عمل اس صورت میں ضروری ہوگا جب کہ حق دار بھی معلوم ہو اور وہ چیز بھی معلوم و متعین ہو جو حق تلفی کرکے لی گئی ہے، بصورت دیگر اسے توبہ و استغفار کے ساتھ تلافی کی ممکن کوشش کرنی چاہیے۔

(۶) اگر وہ کسی غیر الٰہی نظام حکومت میں کوئی کلیدی منصب رکھتا ہو یا اس کی مجلس قانون ساز کا رکن ہو یا اس کے نظام عدالت میں فصل مقدمات کے عہدے پر مامور ہو تو اس سے دست بردار ہو جائے۔

(۷) حسب استطاعت دفعہ ۶ (یعنی شرائط رکنیت) کے مطالبات کو پورا کرے۔

(۸) اپنی استعداد و استطاعت کے مطابق بندگان خدا کو اس عقیدے اور نصب العین کی طرف دعوت دے جن کی وضاحت دفعہ ۳ اور ۴ میں کی گئی ہے اور جو لوگ اس عقیدہ و نصب العین کو قبول کرلیں انھیں اقامت دین کے لیے اجتماعی جدوجہد کرنے پر آمادہ کرے۔" (ص : ۱۱،۱۲)

ان ذمہ داریوں کی انجام دہی کو بھی معناً و عملاً شرطِ رکنیت ہی سمجھنا چاہیے۔ چنانچہ ان وجوہ میں سے، جن کی بنا پر کسی رکن کا نظام جماعت سے اخراج عمل میں آجاتا ہے، ایک وجہ ان ذمہ داریوں میں سے کسی ذمہ داری کی پیہم خلاف ورزی بھی ہے (دستور ص: ۳۷) جس کا مطلب واضح طور پر یہی ہوا کہ جس شخص کو رکن بنالیا گیا ہو اس کے طرز عمل میں ان عملی تبدیلیوں کا پایا جانا اس کی رکنیت کے حق بجانب ٹھہرنے اور برقرار رہنے کے لیے لازمی اور ضروری ہے۔ اس لیے جو کوئی ان ذمہ داریوں اور شرطوں کو معقول حدود میں پورا نہ کرسکے اس کے بارے میں بجا طور

پر یہ سمجھ لیا جائے گا کہ وہ اپنے عہد میں صادق نہ تھا، یا یہ کہ اب نہیں رہ گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں نظام جماعت سے اس کا ضابطے کا رشتہ منقطع کر دیا جائے گا اور اسے تحریک کے ایک ہمدرد یا متفق کی حیثیت دیدی جائے گی۔

تحریک کے جماعتی نظام میں باضابطہ شرکت (رکنیت) کے لیے یہ شرطیں اور احتیاطیں یقیناً غیر معمولی نوعیت کی اور بڑی سخت ہیں۔ مگر ہر صاحب نظر کو محسوس کرنا چاہیے کہ ایسا کرنا ایک اسلامی دعوت اور اقامت دین کی تحریک کے لیے بالکل ناگزیر تھا۔ ایک تو ان شرطوں اور ذمہ داریوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جسے قرآن مجید نے اپنے مخلص پیرووں کے لیے ضروری یا مطلوب نہ قرار دیا ہو، جب کہ تحریک اسلامی کے لیے کارآمد کارکن اور "قرآن اور اسلام کا مخلص پیرو، دراصل ایک ہی شے کے دو نام ہیں۔ دوسرے تحریک اسلامی جس نوعیت کی تحریک ہے اور اس کے سامنے جتنا بڑا اور جتنا دشوار کام ہے، اسے دیکھتے ہوئے کون کہہ سکتا ہے کہ اس کے ساتھ وہ شخص چند قدم بھی چل سکتا ہے، جس کا اس کے نصب العین سے ذہنی اور عملی رابطہ اتنا مضبوط، جس کی عزیمت ایمانی اتنی بلند اور جس کی سیرت اتنی پاکیزہ نہ ہو کہ وہ ان شرطوں اور ذمہ داریوں کو پورا کر سکے؟ کوئی شک نہیں کہ اگر اس معیار سے بھی گرے ہوئے لوگوں کو تحریک کا ممبر بنالیا گیا، یا انھیں ممبر باقی رکھا گیا، تو نہ صرف یہ کہ وہ اس کے کام کے نہ ہوں گے، بلکہ اس کے لیے بوجھ بن جائیں گے، اس کے لیے طاقت کے نہیں، بلکہ کمزوری کے موجب ہوں گے، اس کے جسم کا آماس ثابت ہوں گے اور اس کی ساکھ کو ختم کر کے رکھ دیں گے۔ اس لیے اس کی یہ ایک بنیادی ضرورت تھی کہ یہ اپنی رکنیت کی شرطیں اور ذمہ داریاں اتنی ہی بلند اور ایسی ہی واضح و متعین رکھے اور پھر ان کے بارے میں لوگوں کا پوری شدت سے احتساب بھی کرتی رہے۔ یہ کوئی تشدد پسندی ہرگز نہیں ہے بلکہ صاف وصریح حقیقت پسندی ہے۔

(۲) جماعتی نظام کا ڈھانچہ

اس نظام کی تفصیلی شکل حسب ذیل ہے:

(الف) پورے جماعتی نظام (جماعت) کا ایک منتخب سربراہ ہوتا ہے، جسے "امیر جماعت" کہا جاتا ہے۔ اس کا انتخاب ہر چار سال بعد انتخابی حلقوں کے چنے ہوئے ارکان، جن کو

دستور میں ''نمائندگان'' کہا گیا ہے، اپنے اتفاق رائے یا اپنی کثرت رائے سے کرتے ہیں۔ یہ انتخاب 'مجلس نمائندگان' کے اجلاس میں کافی بحث و گفتگو اور غور وفکر کے بعد ہوتا ہے۔ اس انتخاب کے لیے معیار صرف وہ ایمانی اور علمی و عملی صفات ہوتی ہیں جو اس بھاری اور ہمت آزما منصب کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے از روئے دین و دانش لازماً مطلوب ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ تحریک کو، اس کے دستور کے مطابق، صحیح خطوط پر چلانا ہی 'امیر جماعت' کی اصل ذمہ داری ہوتی ہے۔ (امیر جماعت کے بارے میں مطلوبہ صفات کی اور اس کے فرائض و اختیارات کی تفصیلات دستور کے صفحات ۱۸، ۱۹اور ۲۰ تا ۲۴ میں دیکھی جاسکتی ہیں)

(ب) جس مقام پر ایک سے زیادہ ارکان (ممبر) ہوتے ہیں، وہاں جماعت کی ایک شاخ قائم کردی جاتی ہے اور ان ارکان میں سے جو شخص بھی اپنی دینی، فکری اور عملی صفات میں بحیثیت مجموعی سب سے بہتر ہوتا ہے، اسے ان کا یعنی اس مقامی جماعت کا 'امیر' (صدر یا سربراہ) مقرر کردیا جاتا ہے، جو وہاں کے جماعتی نظم کا اور دوسرے ارکان کی رہنمائی اور تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

(ج) چونکہ ملک بہت بڑا ہے اور قریب قریب اس کے سارے ہی اطراف میں تحریک کا کام پھیلا ہوا ہے، اس لیے تنظیمی ضرورت اور سہولت کار کی خاطر پورے ملک کو کئی حلقوں میں تقسیم کردیا گیا ہے۔ انھیں تنظیمی صوبے سمجھیے۔ اس وقت ان تنظیمی حلقوں کی تعداد سترہ ہے۔ ہر حلقے کا ایک امیر ہوتا ہے۔ جو 'امیر حلقہ' کہلاتا ہے۔ اس کا تقرر بھی اسی طرح سے ہوتا ہے جس طرح کہ 'مقامی' امیروں کا ہوا کرتا ہے۔ حلقے کے اندر پائی جانے والی ساری مقامی جماعتیں اور منفرد ارکان امیر حلقہ کے تحت ہوتے ہیں اور وہ ان سب جماعتوں کے نظم ونسق کا، اور ان سارے ارکانِ حلقہ کی رہنمائی اور تربیت کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ تحریک اور اس کی تنظیم سے تعلق رکھنے والے مسائل و معاملات میں عام طور سے یہی 'امیر حلقہ' امیر جماعت (یعنی کل ہند مرکزی امیر) اور مقامی جماعتوں کے امراء وارکان کے درمیان واسطہ ہوا کرتا ہے۔

(د) ان سارے مقامی اور حلقہ وار انتظامات کے باوجود، چونکہ نظم جماعت اور تحریک کو چلانے کی آخری ذمہ داری 'امیر جماعت' ہی پر ہوتی ہے۔ اور یہ امراء حلقہ، اور ان کے ذیل میں سارے مقامی امراء بھی، دراصل اس کے دست و بازو کی حیثیت رکھتے ہیں جن کے ذریعہ وہ

ملک کے دور و دراز گوشوں تک تحریک کی نگرانی اور رہنمائی کے فرائض انجام دیتا ہے، اس لیے خود ان امراء حلقہ کے کاموں کی دیکھ بھال اور ان کی ضروری رہنمائی بھی اس کی لازمی ذمہ داری قرار پاتی ہے، جسے اسے بہر حال ادا کرنا ہوتا ہے۔ ورنہ تحریک کا نہ تو جماعتی نظم و نسق درست رہ سکتا ہے، نہ اس کے کاموں میں ہم آہنگی برقرار رہ سکتی ہے۔ لیکن منصب امارت کی گونا گوں ذمہ داریوں کی موجودگی میں عملاً یہ کسی طرح ممکن نہیں کہ وہ امرائے حلقہ کے کاموں کی نگرانی اور ان کی رہنمائی کے سلسلے کی بھی ساری ضرورتوں اور ذمہ داریوں کو براہ راست خود ہی پورا کر سکے۔ اس لیے جملہ تنظیمی امور کی انجام دہی کے لیے امیر جماعت کے تحت ایک مرکزی شعبہ قائم ہے، جس کا سربراہ ''قیم جماعت'' کہلاتا ہے (جسے عام اصطلاح کے لحاظ سے سکریٹری جنرل سمجھنا چاہیے)۔ قیم جماعت، امیر جماعت کے زیر ہدایت، تحریک کے تمام مرکزی شعبوں کے نظم و نسق کی نگرانی کرتا ہے، اس کے عام نظم کو ٹھیک ٹھیک قائم رکھتا ہے، سارے تنظیمی حلقوں سے رابطہ اور ان پر نگاہ رکھتا ہے، ان سے تحریک کے کاموں کی رپورٹیں لیتا ہے اور ضرورت کے مطابق انھیں ہدایتیں دیتا رہتا ہے۔ ان فرائض کو انجام دینے کے لیے اسے متعدد معاونوں (نائب سکریٹریوں) کی مدد حاصل ہوتی ہے۔ (دستور، ص: ۲۸، ۲۹)

نظام جماعت کی شورائیت

تحریک کا یہ پورا جماعتی نظام، اپنی ابتدائی سطح سے لے کر مرکزی سطح تک، شورائی ہے۔ اس نظام کی جو تفصیلات اس کے دستور میں بیان ہوئی ہیں، ان کا سب سے پہلا ہی فقرہ، ـــــ جو دراصل ایک اہم بنیادی نکتے اور اصول کی حیثیت رکھتا ہے ـــــ یہ ہے:

''جماعت اسلامی ہند کا نظام شورائی ہوگا۔'' (ص: ۱۴)

اس شورائیت کا مفہوم اور معیار مطلوب اس کے نزدیک یہ ہے کہ فیصلے کے لیے زیر غور و بحث آنے والا ہر مسئلہ اتفاق رائے سے طے ہوا کرے، اور اس کے دستور نے تاکید کی ہے کہ شورائیت کے اس معیار مطلوب کو حاصل کرنے کی پوری پوری کوشش کی جائے۔ (ص: ۱۷ اور ص: ۲۷) یہ اس لیے کہ مؤثر و بامعنی اور اتحاد آفریں شورائیت تحریک کے بہترین مفاد کا ضروری تقاضا بھی ہے اور اس سے بڑھ کر اس کتاب اور سنت کا تاکیدی مطالبہ بھی ہے جو اس دعوت کے

طریق کار کی اصل واساس ہیں۔ چنانچہ قرآن حکیم نے باہمی مشاورت کو اس وقت سے اہل ایمان کی ایک امتیازی صفت اور ضروری علامت قرار دے رکھا ہے جب کہ دعوت قرآنی کا بالکل ابتدائی دور تھا اور وہ آزادی واقتدار کے ظاہری امکان سے بھی دور تھے اور شہری حقوق سے بھی یکسر محروم[1] تھے۔ حد یہ ہے کہ اللہ کے رسول ﷺ تک کو صریح ہدایت تھی کہ اہم اجتماعی معاملات میں اپنے ساتھیوں سے مشورہ کرلیا کریں[2] حالانکہ دنیا میں کوئی ہستی اگر صلاح ومشورے سے بلند ہوسکتی تھی تو وہ آپؐ کی ہستی تھی، جو صرف یہی نہیں کہ سراپا حکمت و دانش تھی، بلکہ اس کی ہمہ وقت رہنمائی کے لیے اوپر سے وحی الٰہی کا فیضان بھی جاری تھا۔ لیکن آپؐ اس حکم خداوندی پر عمل کرتے تھے اور باہمی صلاح ومشورے کے معیاری مقصد (اتفاق رائے سے فیصلہ) کو اتنی اہمیت دیتے تھے کہ بسا اوقات اس کی خاطر اپنی ذاتی رائے کو پس پشت ڈال دیتے اور عام رجحان کے مطابق فیصلے کر دیتے۔ آپؐ کا یہ اسوہ دین میں شورائیت کی غیر معمولی اہمیت ہی کا نہیں، اس کے معیار مطلوب کے حصول کی خاطر انتہائی حد تک کی کوشش کا بھی ناقابل اختلاف ثبوت ہے۔

شورائیت کے بہترین تقاضے پورے کیے جانے کے بعد بھی کبھی کبھی اختلاف رائے کا باقی رہ جانا ایک ناگزیر حقیقت ہے۔ اس لیے یہ سوال بہر حال ایک ضروری اور عملی سوال ہے کہ اختلاف رائے ختم نہ ہوسکنے کی صورت میں تحریک کا جماعتی نظام فیصلے کا طریقہ کیا اختیار کرتا ہے؟ یہ سوال ہر تنظیم اور پارٹی کے سلسلے میں پیدا ہوا کرتا ہے، اور وہاں اس کا جواب یا تو یہ دیا جاتا ہے کہ آخری فیصلے کا حق تنظیم کے سربراہ کو حاصل ہے، وہ اہل مشورہ کی اکثریت ہی کے خلاف نہیں، بلکہ ان کی صد فی صد اکثریت کے خلاف بھی فیصلہ کرسکتا ہے، یا پھر یہ دیا جاتا ہے کہ فیصلہ اہل مشورہ کی مطلق اکثریت سے ہوتا ہے۔ پہلا طریقہ 'آمریت' کا ہے، اور دوسرا جمہوریت کا ہے۔ کوئی شبہ نہیں کہ ان میں سے ہر طریقہ اپنے اندر کچھ نہ کچھ مخصوص مصلحتیں اور فائدے رکھتا ہے۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ ان میں سے ہر ایک کے اندر کچھ نہ کچھ زبردست خطرے اور مفسدے بھی موجود ہیں۔ چنانچہ جمہوریت اگر فرد کی شخصیت کی حفاظت کرتی ہے اور اس کے آزاد ارتقاء کے

---

[1] سورۂ شوریٰ آیت : ۳۸

[2] سورہ آل عمران آیت : ۱۵۹

حق میں سازگار بنتی ہے تو ساتھ ہی اکثر اوقات ملک اور معاشرے کے لیے انتشار اور کمزوری کا ذریعہ بھی بن جایا کرتی ہے۔ اسی طرح آمریت اگر ملکی اتحاد اور سیاسی استحکام کا موجب بنتی ہے تو اسی کے ساتھ آزادی فکر ورائے کا گلا بھی گھونٹ دیتی ہے اور فرد کی شخصیت کو کچل کر رکھ دیتی ہے۔ تحریک و دعوت اسلامی کے لیے قدرتی طور پر یہ دونوں ہی طریقے نا قابل قبول تھے، کیونکہ ان میں سے ہر ایک جن خطرات و مفاسد کا حامل ہے انھیں وہ کسی حال میں بھی انگیز نہیں کرسکتی۔ اس لیے اس نے اپنے یہاں فیصلے کا ایک ایسا درمیانی اور متوازن طریقہ مقرر کر رکھا ہے جس میں مصلحتیں اور خوبیاں تو آمریت اور جمہوریت، دونوں کی موجود ہیں، مگر خطرے اور مفسدے ہر ایک کے قریب قریب ناپید ہیں۔ اور وہ یہ ہے کہ اہم مسائل کے فیصلوں کے سلسلے میں تحریک کا سربراہ (امیر جماعت) نہ مختار مطلق ہے نہ اہل شوریٰ کی معمولی اکثریت کا پابند، وہ اگر پابند ہے تو بڑی اور نمایاں (تقریباً ۶۷ فیصد) اکثریت کا، اور اگر اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کرنے کا اسے اختیار ہے تو مناسب و متعین حدود کے اندر ہی ہے۔[۱]

اس طریقے کے اندر جہاں مشاورت کو ایک معقول اور موثر مقام حاصل ہے، وہیں عقل اور انصاف کے اس کھلے ہوئے تقاضے کی پوری پوری رعایت بھی موجود ہے کہ جس شخص کو اس کی برتر صفات اور دینی، اخلاقی، علمی، فکری اور عملی صلاحیتوں کی بنا پر پوری تحریک کی سربراہی اور قیادت کے لیے منتخب کیا گیا ہو، اہم مسائل کے حل اور فیصلے میں اس کی رائے بھی بس ایک عام قسم کی رائے نہ قرار پائے، اور اسے بھی صرف اتنا ہی وزن ہرگز نہ حاصل ہو جتنا وزن کہ دوسری رایوں کا ہو۔

اس پوری احتیاط اور رعایت اعتدال کے باوجود یہ دعویٰ کرنا صحیح نہ ہوگا کہ عملی طور پر اب مشکلات اور پیچیدگیوں کے پیدا ہونے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ لیکن دعوت و تحریک اسلامی کے امتیازات میں سے ایک اہم امتیاز یہ بھی ہے کہ اس کے پاس اس امکانی اندیشے سے عہدہ برآ ہونے کا موثر ذریعہ موجود ہے، جبکہ دنیا کی ہر دوسری تحریک اور تنظیم اس طرح کے کسی ذریعے سے یکسر محروم ہوتی ہے۔ اس 'ذریعے' سے مراد وہ احساس ذمہ داری، وہ

---

[۱] تفصیل معلوم کرنے کے لیے دیکھیے دستور ص : ۲۷، ۲۸۔

خوف خدا اور وہ اخلاص باہم ہے جسے یہ تحریک اپنے کارکنوں، بالخصوص اپنے ذمہ داروں کے اندر پیدا کر دیا کرتی ہے اور جس سے وہ متصف ہوتے ہیں، یا کم از کم یہ کہ انھیں لازماً متصف ہونا چاہیے۔ یہ ایمانی اور اخلاقی صفات انھیں خود رائی اور بے جا اصرار سے محفوظ رکھتی ہیں۔ جس کے نتیجے میں جمہوریت اور آمریت، دونوں ہی کی خرابیوں سے امان مل جاتی ہے اور شورائیت کے حقیقی فوائد حاصل ہو جاتے ہیں۔

نظم کی پابندی

یہ پورا جماعتی نظام 'سمع وطاعت' کی بنیادوں پر قائم ہے۔ عام ارکان کے لیے ضروری ہے کہ اپنے امیر کے احکام و ہدایات کو سنیں اور ان کی تعمیل کریں۔ یہ تعمیل ظاہر ہے کہ بالکل رضا کارانہ ہوتی ہے۔ کیونکہ یہاں معروف معنوں کا کوئی اقتدار اور اختیار نہ اس وقت موجود ہے، کہ لوگ اس کے فرمانوں کے آگے جھک پڑنے پر مجبور ہوں اور نہ مستقبل قریب میں اس کی کوئی توقع نظر آتی ہے۔ اسی طرح یہاں کسی دنیوی منفعت کا بھی کوئی سوال نہیں، کہ اس کا لالچ طاعت امر کی ترغیب دے سکے۔ اس لیے یہاں اگر اطاعت پائی جاتی ہے تو وہ سرتاسر رضا کارانہ ہی ہو سکتی ہے۔ لیکن اس کے رضا کارانہ ہونے کے معنی بھی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ پھر وہ صرف نام کی اطاعت ہوگی۔ بلکہ کام کی اطاعت ہے جس کے مقابلے میں قانون کے دباؤ یا سزا کے خوف، یا کسی مفاد کے لالچ سے کی جانے والی معروف اطاعتوں کی کوئی حیثیت نہیں رہ جاتی۔ یہ اس لیے کہ وہ کوئی سیاسی یا قومی ضرورت نہیں بلکہ ایک دینی ضرورت یقین کی جاتی ہے اور اسے رضائے الٰہی کا موجب سمجھ کر اختیار کیا جاتا ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ کسی حکم کی وہ تعمیل، جو دینی ضرورت سمجھ کر اور دینی جذبے کے ساتھ کی جاتی ہے، اپنی مثال آپ ہی ہوتی ہے، دوسری کوئی اطاعت نہ اپنی روح میں اس کی ہم سری کر سکتی ہے اور نہ اپنے عملی نتائج و آثار میں۔

لیکن یاد رہے کہ یہ اطاعت اپنی نوعیت میں اتنی بے نظیر ہونے کے باوجود غیر مشروط نہیں ہوتی، بلکہ معروف کی شرط کے ساتھ مشروط رہتی ہے۔ معروف سے مراد ہر وہ حکم یا ہدایت یا فیصلہ ہے جس میں شریعت الٰہی کی کوئی خلاف ورزی لازم نہ آتی ہو۔ اس شرط کی وجہ بالکل واضح ہے۔ تحریک اسلامی کی سربراہی کے لیے کسی شخص کا انتخاب یا تقرر تو ہوتا ہی اس غرض سے ہے کہ وہ اس

کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اور دین حق کو قائم کرنے کے جدوجہد میں، خود بھی کوشاں رہے گا اور دوسروں کی بھی رہبری کرے گا۔ اب اگر وہ خدانخواستہ اس دین کے احکام یا اس کے منشا کے خلاف کوئی ہدایت یا فیصلہ دیتا ہے تو یہ واضح طور پر اس دین کا قائم کرنا نہیں بلکہ اسے ڈھادینا ہوگا۔ اسی طرح وہ رکن جماعت بھی جو ایسے کسی حکم یا فیصلے کی تعمیل کر ڈالے، اپنے اس عمل سے دین کی جڑوں پر کلہاڑا چلا دینے والا ہی ثابت ہوگا، حالانکہ وہ رکن، اسے مضبوط کرنے کے لیے بنا تھا۔ اس لیے جس طرح منشائے دین کے خلاف کسی حکم کا دینا جائز نہیں، اسی طرح ایسے کسی حکم کا ماننا بھی جائز نہیں۔ چنانچہ رسول خدا ﷺ نے صراحت فرما رکھی ہے کہ 'معروف' میں اصحاب امر کی اطاعت کی جائے گی، اور ضرور کی جائے گی، لیکن معصیت کے کاموں میں کسی کی اطاعت نہیں کی جاسکتی۔

کوئی شک نہیں کہ اطاعت امر کے سلسلے میں معروف کی یہ شرط تحریک اسلامی اور اس کے جماعتی نظام کو دوسری تمام تحریکوں اور تنظیموں سے اور ان کے جماعتی نظاموں سے ممتاز اور افضل بنا دیتی ہے، جو اپنے معاملات میں معروف و منکر، حق و ناحق، انصاف و ظلم اور اخلاق و بداخلاقی کی بحث کو کبھی کوئی اہمیت ہی نہیں دیا کرتیں، اور جو بالعموم میری پارٹی بہر حال حق پر ہے، کے نظریے کی قائل ہوا کرتی ہیں، اور جن کے یہاں اصحاب امر کا ہر حکم واجب الاتباع ہوا کرتا ہے، چاہے وہ حق اور معروف کے مطابق ہو چاہے خلاف۔

ارکان کی تربیت

تربیت کا مفہوم

اس تحریک کی نظر میں جن باتوں کی خصوصی اہمیت ہے، ان میں سرفہرست اپنے ارکان کی تربیت کا معاملہ بھی ہے۔ اس تربیت کا ایک مخصوص اور بڑا وسیع مفہوم ہے۔ اس سے مراد اصلاح افکار واعمال کی وہ ہمہ گیر کوششیں ہیں، جن کے نتیجے میں لوگوں کا اپنے خدا سے تعلق زیادہ سے زیادہ مضبوط ہوتا جائے، ان کے ذہنوں پر آخرت کی فکر چھاتی چلی جائے، ان کے ایمان میں جلا آتی رہے، ان کا دینی شغف برابر ترقی کرتا رہے اور اسلام سے ان کی واقفیت برابر بڑھتی رہے، ان کے اخلاق کی بلندی، عمل کی صالحیت اور سیرت کی پاکیزگی امتیاز کا درجہ حاصل کرتی جائے، دین کی نصرت اور اقامت کا جذبہ ان کا ذوق اور وجدان بنتا جائے، تحریک کے نصب العین پر اور اس کی حقانیت پر ان کا یقین حق الیقین سے بدلتا جائے، ان کے تحریکی افکار میں برابر گہرائی اور یکسوئی آتی جائے اور حق کی خاطر اپنی خواہشیں، اپنی دل چسپیاں، اپنے مفادات اور اپنے جذبات قربان کرنے کا عزم قوی سے قوی تر ہوتا جائے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا، تربیت کا یہ مفہوم غیر معمولی حد تک وسیع ہی نہیں، بلکہ اس کے معروف مدعا ومفہوم سے حد درجہ مختلف بھی ہے۔ اپنے ممبروں کو تربیت اور ٹریننگ دوسری تحریکیں اور پارٹیاں بھی دیتی ہیں، مگر صاف دیکھا جاسکتا ہے کہ اس تربیت اور ٹریننگ کے تصور کو تحریک اسلامی کے تصور تربیت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ اس کے مقابلے میں یہ تصور تربیت اتنا وسیع، اتنا عظیم اور اتنا غیر معمولی ہے کہ دوسرے لوگ اس کا ادراک بھی بڑی مشکل سے کرسکتے ہیں۔ اس لیے تحریک اسلامی کو سمجھنے کے لیے

ضروری ہے کہ اس کے اس تصورِ تربیت کو بھی اچھی طرح ذہن نشیں رکھا جائے اور اس کے معنی ہرگز وہ نہ سمجھے جائیں جو عام طور سے جانے اور سمجھے جاتے ہیں۔

ضرورت اور غایت

تحریک اسلامی جس نوعیت کی تحریک ہے اس کے پیش نظر اس کے ارکان کی مذکورہ بالاقسم کی تربیت اس کی ایک ناگزیر اور بدیہی ضرورت تھی اور رہے گی۔ تحریک کی یہ مخصوص نوعیت معلوم کرنے کے لیے ان مباحث پر ایک نظر ڈال لینا کافی ہوگا جو اس کے نصب العین کی تعبیر اور تشریح کے طور پر اور اس کے طریق کار کی وضاحت کے سلسلے میں اوپر گزر چکے ہیں۔ ان مباحث میں دو اہم حقیقتیں پوری طرح نمایاں دیکھی جاسکتی ہیں: ایک تو یہ کہ یہ تحریک اپنے مقاصد کی بلندی میں بھی اور اپنی راہ کی مشکلات میں بھی، اپنی کوئی نظیر نہیں رکھتی۔ دوسری یہ کہ اس کے لیے اپنے ارکان کی ایمانی عزیمت، اخلاقی طاقت، فکری اصابت، ذہنی یکسوئی، عملی حسن، دینی شغف اور تحریکی جوش و جذبہ ہی قوت کا وہ حقیقی سرمایہ ہے، جس سے وہ اپنی مشکل اور صبر آزما جدوجہد کو کامیابی سے آگے بڑھا سکتی ہے۔ اس کے سوا اس کے پاس فی الواقع نہ کوئی اور حقیقی قوت ہوسکتی ہے، نہ کسی اور قوت کو وہ استعمال کرسکتی ہے، نہ اس کا استعمال اسے راس آسکتا ہے۔ پہلی بات تقاضا کرتی ہے کہ اس کے علم بردار اور کارکن اپنے اندر شیر جیسا دل پیدا کریں، طوفانی دھاروں کے رخ پر تیرنا سیکھیں، ہر طرح کی چوٹ کھانے اور ہر مفاد کی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں، ابتدائی انسانی حقوق سے بھی محروم کردیے جانے کے متوقع رہیں، صرف غیروں ہی کی نہیں خود اپنوں کی بھی شدید ترین مخالفتوں سے سابقہ پیش آنے کو یقینی سمجھیں اور ان سے کامیاب پنجہ آزمائی کا اپنے اندر عزم و حوصلہ رکھیں۔ اسی طرح دوسری بات کا مطالبہ یہ ہے کہ ان کی سیرت بے داغ ہو، ان کے اخلاق میں دلوں کو جیت لینے والی کشش موجود ہو، وہ برائی کو بھلائی سے دفع کرنا جانتے ہوں اور اپنے قول ہی سے نہیں، بلکہ عمل سے بھی دین کی سچی شہادت دے رہے ہوں۔ اب غور کیجیے کہ ان دونوں ہی قسم کے مطالبوں کو پورا کرنا کن اور کیسے لوگوں کے لیے ممکن ہے؟ اور تحریک کے کارکن کب اس طرح کے افراد بن سکتے ہیں؟ اس سوال کا یقیناً ایک ہی جواب ہوگا اور وہ یہ کہ اس معیار کے افراد وہ اسی وقت بن سکتے ہیں جب ان کے اندر ایک طرف تو اپنے خدا

سے گہرا تعلق ہو، اس کی خوشنودی کی تمنا ان کے دلوں کی دھڑکن بن چکی ہو، دنیا ان کی نگاہوں میں ہیچ ہو، اور آخرت کی طلب سے وہ سرشار ہوں، دوسری طرف انھیں اپنے نصب العین کی حقانیت اور ضرورت کا بھی سچا یقین ہو، ان کا ذہن تحریک کے اصول و مقاصد کے بارے میں اتنا مطمئن اور صاف ہو کہ دوسرے افکار و نظریات کا کوئی حملہ انھیں اپنی جگہ سے بال برابر بھی نہ ہٹا سکے۔ ظاہر ہے کہ ایمان اور ذہنی اطمینان کا یہ مقام آسانی سے حاصل نہیں ہوا کرتا، نہ حاصل ہو جانے کے بعد لازماً برقرار ہی رہتا ہے۔ بلکہ اسے حاصل کرنے کے لیے بھی اور برقرار رکھنے کے لیے بھی، پیہم اور ہمہ جہتی سعی و جہد ضروری ہے۔ اس لیے اگر تحریک اسلامی نے اپنے ارکان کی تربیت کو اتنی غیر معمولی اہمیت دی ہے تو دینا ہی چاہیے تھا۔ ورنہ اس کے سامنے جو عظیم مقصد اور دشوار مہم ہے وہ اس کی ذمہ داریوں کو ہرگز نہ اٹھا سکتے۔ قرآن حکیم اور اسوۂ رسولؐ کا مطالعہ کیجیے تو معلوم ہوگا کہ آپؐ کو اپنے اصحابؓ کی تربیت پر کتنی توجہ کرنے کی ہدایت کی گئی تھی اور آپؐ نے کتنے اہتمام سے اس ہدایت پر عمل فرمایا تھا۔

یہ صحیح ہے کہ تحریک کے جماعتی نظام میں باضابطہ داخل کرنے سے پہلے لوگوں کو اچھی طرح جانچ پرکھ لیا جاتا ہے اور ان کے افکار و اعمال کے بارے میں دینی اور تحریکی نقطۂ نظر سے کافی اطمینان حاصل کر لینے کے بعد ہی انھیں رکن بنایا جاتا ہے۔ لیکن اس کے باوجود نہ تو اس حقیقت سے انکار ممکن ہے کہ لوگ جس ایمانی عزیمت، فکری پختگی اور عملی جذبے کے ساتھ تحریک میں داخل ہوتے ہیں آیندہ چل کر اس میں زوال بھی آ سکتا ہے، اور نہ اس امر واقعی کو نظر انداز کر دینا صحیح ہوگا کہ تحریک کی رکنیت حاصل کر لینے کے معنی یہ ہرگز نہیں ہیں کہ متعلقہ افراد، رکنیت کے معیار مطلوب کو پہنچ گئے ہیں اور اب انھیں ایمانی، اخلاقی، فکری اور عملی کسی حیثیت سے بھی اصلاح و ترقی کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لیے ارکان تحریک کی تربیت کی فکر نہ کرنے کے معنی اس کے سوا اور کچھ نہ ہوتے کہ تحریک اپنی قوتوں کو زنگ خوردہ ہوتے رہنے کے لیے آزاد چھوڑ دیتی اور اس طرح اپنے مستقبل کو خود تاریک بنا لیتی۔ کیونکہ انھیں قوتوں کی تازگی اور مؤثر کارکردگی ہی پر تو اس کی سعی و جہد کے کارگر اور بارآور ہونے کا اصل انحصار ہے۔

اس تربیت کے دو پہلو ہیں: ایک منفی، دوسرا مثبت۔ منفی پہلو تو یہ ہے کہ تحریک کے ارکان اس کے جماعتی نظام میں شامل ہونے کے وقت اقامت دین کے نصب العین سے جو

وابستگی رکھتے ہیں اوران کے ایمان وعمل کی جو حالت ہوتی ہے، اس میں کوئی کمی نہ واقع ہونے پائے اوراس غرض سے اس غبار کو برابر صاف کیا جاتا رہے، جو نفس کے دباؤ، شیطان کی وسوسہ اندازی اور موجودہ خدافراموش ماحول کی مردافگن ناسازگاریوں کے باعث، ان کے دل ودماغ پرلازماً پڑتا رہتا ہے۔ مثبت پہلو یہ ہے کہ نصب العین سے ان کی یہ وابستگی برابر ترقی کرتی جائے، ایمان وعمل کی اس حالت میں مسلسل جلا آتی رہے اوراس غرض سے ہر وہ تدبیر اختیار کی جائے جو اختیار کرنے کی ہو۔

تربیت کا عملی نظام

تحریک کے جماعتی نظام نے اپنے ارکان کی تربیت کا جو عملی اہتمام کررکھا ہے، اس میں درج ذیل امور کو بنیادی ذرائع کی حیثیت دی گئی ہے:

(۱) قرآن اور حدیث کا ذاتی مطالعہ، براہ راست یا ترجموں کی مدد سے۔

(۲) قرآن یا حدیث کا تذکیری درس۔

(۳) سیرت نبوی، سیرت صحابہ اور سیرت صلحائے امت کا مطالعہ۔

(۴) تحریک کے لٹریچر، خصوصاً اس کے بنیادی حصے کا اجتماعی اور انفرادی مطالعہ۔

(۵) تربیتی تقریریں۔

(۶) ذاتی احتساب۔

(۷) ایک دوسرے کی اصلاح (تواصی بالحق)

اس معاملے میں صورت واقعی یہ نہیں ہے کہ اصلاح وتربیت کا یہ کام کلیۃً ارکان جماعت کے اپنے احساس ذمہ داری ہی پر چھوڑ دیا گیا ہو، بلکہ کچھ اصول وضوابط بنا کر اس اہم کام کا ایک نظم قائم کردیا گیا ہے۔ تاکہ تربیت کا مقصد زیادہ سے زیادہ بہتر طریقے پر حاصل ہوسکے۔ اس نظم کی مختصر تفصیل یہ ہے:

● ہر مقامی جماعت کے لیے ضروری ہے کہ وہ ہفتہ میں کم از کم ایک بار اپنا اجتماع منعقد کرے، جس میں ہر رکن لازماً شریک ہو۔ اس اجتماع کی نوعیت اصلاً تربیتی ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے درس قرآن، درس حدیث، تقریر اور تحریک کے لٹریچر کے اجتماعی مطالعے جیسے ذرائع

سے کام لیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ مقامی امیر ہر رکن کی ہفتہ بھر کی دعوتی اور تربیتی سرگرمیوں کی اور قرآن، حدیث اور لٹریچر کے مطالعے کی رپورٹ بھی لیتا ہے اور اسے مناسب ہدایتیں بھی دیتا ہے۔

● ہر امیر مقامی اور امیر حلقہ کی یہ ایک نمایاں دستوری ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے ماتحت ارکان کی تربیت کرتا رہے۔ چنانچہ اس غرض سے وقتاً فوقتاً ضلعی یا حلقہ واری اجتماعات بھی منعقد ہوا کرتے ہیں، جن کا سارا پروگرام صرف تربیتی سرگرمیوں پر مشتمل ہوا کرتا ہے۔

● ضروری ہے کہ ایک متعینہ مدت کے بعد مقامی امراء کی طرف سے حلقوں کے امراء کو اور پھر حلقوں کے امراء کی طرف سے مرکزی نظم کو تمام جماعتی حالات اور تحریکی سرگرمیوں کی مفصل رپورٹیں ملتی رہیں۔ ان رپورٹوں سے مرکزی نظم کو دوسری باتوں کے علاوہ یہ بات بھی برابر معلوم ہوتی رہتی ہے کہ امراء کی تربیتی کارگزاریاں کیا رہیں اور عام ارکان دینی، اخلاقی اور عملی لحاظ سے کس مقام پر ہیں جس کے بعد وہ انھیں مناسب ہدایتیں بھیجتا رہتا ہے۔

● امیر جماعت، قیم جماعت اور معاونین قیم کے پروگراموں میں یہ بات بھی شامل رہتی ہے کہ وہ ضرورت اور وقت کی گنجائش کے مطابق پورے ملک کے دورے کرتے ہیں، جن کا اولین مقصد مقامی جماعتوں کے حالات کا قریب سے جائزہ لینا اور وہاں کے ارکان کی تربیت کرنا ہوتا ہے۔

● مقامی جماعتوں کے ہفتہ وار اجتماعات کے علاوہ مختلف اوقات میں ضلعی اور حلقہ وار اور کل ہند اجتماعات بھی منعقد ہوا کرتے ہیں، جن کے پروگرام کے بھی بیشتر حصے تربیتِ ارکان ہی سے متعلق ہوتے ہیں۔

میدانِ عمل کی تربیت

ایک طرف تو تربیتِ ارکان کی یہ تدبیریں اور یہ ذرائع ہیں، جن کی حیثیت بالعموم نظری قسم کی ہے، دوسری طرف وہ عملی تربیت ہے جو انھیں دعوتی جدوجہد کے میدان میں آپ سے آپ حاصل ہوتی رہتی ہے۔ کیونکہ جب وہ حق کی شہادت اور اللہ کے دین کی تبلیغ و اقامت کا فریضہ انجام دینے کے لیے آگے بڑھتے ہیں تو قدرتی طور پر خود ان کی اپنی اصلاح و تربیت کے بھی کتنے ہی قوی اسباب آپ سے آپ حرکت میں آجاتے ہیں۔ مثلاً جس وقت کوئی شخص

دوسروں کو خدا پرستی کی دعوت دے رہا ہوتا ہے اور ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی تلقین کر رہا ہوتا ہے اس وقت اندر سے اس کا ضمیر بھی اسے آواز دیتا ہے اور باہر کی دنیا بھی اس پر تیز نگاہیں ڈال کر پوچھنے لگتی ہے، کہ اس بارے میں تمہارا خود اپنا کیا حال ہے؟ جس حق کی دعوت تم دوسروں کو دے رہے ہو اس کے لذّت شناس تم خود بھی ہو یا نہیں؟ اگر انسان بالکل ہی بے حس نہ ہو تو ہر طرف سے آنے والی ان تنقیدی آوازوں پر وہ لازماً چونک اٹھتا ہے اور پھر اپنی طرف متوجہ ہو کر اپنے ایمان وعمل کے کھوٹ کو ایک زبردست احساس ندامت کے ساتھ صاف کرنے میں لگ جاتا ہے۔ اسی طرح جب وہ اس دعوت کے سلسلے میں چوطرفی مخالفتوں، عداوتوں اور مصیبتوں سے مسلسل دوچار ہوتا ہے تو اس بھٹی میں تپ کر اس کا ایمان اور کھرا بن جاتا ہے اور محض اللہ کے دین کی خاطر کام کرنے کے جرم میں جب دنیا اس کو اپنے تمام سہاروں سے محروم کر دیتی ہے تو وہ فطری طور پر اپنے پروردگار کی طرف بھاگتا اور اسی کے دامن میں پناہ لیتا ہے، جس کے نتیجے میں اس کے اندر اپنے خدا سے تعلق اور اس پر توکل اور بڑھ جاتا ہے اور جب وہ دیکھتا ہے کہ لوگ اس کے پیغام حیات کو بہرے کانوں سن رہے ہیں اور ہلاکت کی راہوں سے پلٹنے کا نام تک نہیں لیتے تو اس کا داعیانہ جوش سرد پڑنے کے بجائے اور زیادہ بھڑک اٹھتا ہے اور فلاح ونجات کی شاہراہ کی طرف ان کا رخ موڑ دینے کے لیے وہ اور زیادہ سرگرم ہو جاتا ہے۔ غرض ایک داعی حق کی دعوتی جدوجہد مختلف پہلوؤں سے اس کی بہترین مربیّ ثابت ہوتی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی شخص اخلاص وصداقت ہی سے بے بہرہ ہو اور صرف نام کا داعی ہو۔ ایسا شخص تو نہ صرف یہ کہ اپنی دعوتی جدوجہد سے کوئی ایمانی یا عملی قوت نہ حاصل کر سکے گا، بلکہ اپنے کو بے نقاب کر کے میدان عمل سے فرار بھی ہو جائے گا۔ لیکن ظاہر ہے کہ یہاں گفتگو مخلص اور راست باز انسانوں کی ہو رہی ہے، نمائشی لوگوں کی نہیں۔

چونکہ دعوتی جدوجہد تحریک اسلامی کے ہر رکن کے لازمی فرائض میں شامل ہے جیسا کہ اوپر دستور کے حوالے سے واضح کیا جا چکا ہے، اس لیے دعوتی میدان کار کی یہ مؤثر ترین تربیت بھی کچھ نہ کچھ لازماً حاصل ہوتی رہتی ہے۔

تحریک اسلامی کی نظر میں اپنے ارکان کی تربیت کے یہ نظری اور عملی دونوں ہی قسم کے ذرائع یکساں ضروری ہیں۔ کیونکہ ان میں سے اگر کسی ایک کو بھی وہ نظر انداز کر دے تو اپنے مقصد

تربیت میں کبھی کامیاب نہیں ہوسکتی۔ان دونوں کی نوعیت ہی دراصل ایسی ہے کہ ایک کے بغیر دوسرے کی قوت وتاثیر بھی بڑی حد تک معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ گویا ان کی حیثیت ایک گاڑی کے دو پہیوں جیسی ہے، جن میں سے صرف کسی ایک کے بل پر دعوت کی گاڑی ہرگز آگے نہیں بڑھ سکتی۔ یا پھر انھیں تلوار کی صیقل اور اس کا استعمال سمجھے۔ درس ومطالعہ اور تذکیر وموعظت کے ذریعہ انجام پانے والی تربیت اگر تلوار کی صیقل کی مانند ہے، تو دعوتی جدوجہد کے میدان میں حاصل ہونے والی تربیت اس صیقل کی ہوئی تلوار کے استعمال جیسی ہے۔تلوار کا مقصد اسی وقت پورا ہوا کرتا ہے جب اسے صیقل بھی کیا جائے اور مسلسل استعمال بھی۔

معیار مطلوب

تحریک اسلامی اپنے ارکان کو جس حد تک ''تربیت یافتہ'' دیکھنا چاہتی ہے اور ان کی تربیت کا اس کے نزدیک جو مطلوبہ معیار ہے، وہ دو لفظوں میں یہ ہے کہ لوگ اس کے رنگ میں پوری طرح رنگ جائیں اور ان کا ایمان، اخلاق، طرزعمل، طرزفکر، ہرشے ایسی بن جائے جیسی ایک سچے مومن اور مخلص داعی حق کی ہونی چاہیے۔اس بات کو اس نے مبہم یا مجمل نہیں رہنے دیا ہے، بلکہ اس نے پوری وضاحت بھی کر رکھی ہے اور اس وضاحت کو اپنے دستور کے اندر جگہ دی ہے۔ تاکہ وہ ہر رکن جماعت کی نگاہوں کے سامنے ہر وقت نمایاں رہے۔ یہ وضاحت درج ذیل ہے:

''ہر رکن جماعت کو کوشش کرنی ہوگی کہ وہ:

(۱) اسلام اور جاہلیت (غیر اسلام) کے فرق سے باخبر اور حدود اللہ سے واقف ہوجائے۔

(۲) اللہ تعالیٰ سے اپنے تعلق کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرے اور اس کے لیے فرض عبادات کے علاوہ نوافل، اذکار اور تلاوتِ قرآن وغیرہ کا بھی اہتمام کرے۔

(۳) تمام معاملات میں اپنے نقطۂ نظر، خیال اور عمل کو ہدایت الٰہی کے مطابق ڈھالے۔ اپنی زندگی کے مقصد، اپنی پسند اور قدر کے معیار اور اپنی وفاداریوں کے محور کو تبدیل کرکے رضائے الٰہی کے موافق بنائے اور اپنی خودسری اور نفس پرستی کے بت کو توڑ کر تابع امر رب بن جائے۔

(۴) ان تمام رسوم جاہلیت سے اپنی زندگی کو پاک کرے، جو احکام شریعت کے خلاف ہوں۔

(۵) ان تعصّبات اور دل چسپیوں سے اپنے قلب کو اور ان مشاغل، جھگڑوں اور بحثوں سے اپنی زندگی کو پاک کرے جن کی بنا نفسانیت یا دنیا پرستی پر ہو اور جن کی کوئی اہمیت دین میں نہ ہو۔

(۶) فساق و فجار اور خدا سے غافل لوگوں سے مودت وموالات کے روابط ـــــــ نہ کہ عام روابط ـــــــ منقطع کرے، اور نیک اور خدا ترس لوگوں سے ربط و تعلق قائم کرے۔

(۷) کسی غیر الٰہی نظام حکومت کا آلہ ہونے یا اس کے قوانین کے اجراء میں مددگار ہونے کی شکل میں اپنے اس ذریعۂ معاش سے جلد از جلد علیحدہ ہو جائے۔

(۸) غیر اسلامی عدالتوں میں، اضطرار کے بغیر، معاملات کے تصفیے کے لیے نہ جائے۔

(۹) اپنے معاملات کو راستی، عدل، خدا ترسی اور بے لاگ حق پرستی پر قائم کرے۔

(۱۰) اپنی دوڑ دھوپ اور سعی و جہد کو اقامت دین کے نصب العین پر مرتکز کر دے اور اپنی زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے سوا ان تمام مصروفیتوں سے دست کش ہو جائے جو اس نصب العین کی طرف نہ لے جاتی ہوں۔" (ص: ۱۲، ۱۳)

ان تفصیلات سے فکر و عمل کی جو تصویر بنتی ہے وہی تربیت کا معیار مطلوب ہے۔ دین و ایمان کے اسی مقام پر تحریک اپنے ارکان کو فائز دیکھنا چاہتی ہے اور اس کا پورا تربیتی نظام اپنے ارکان کو اسی مقام تک پہنچانے کی خاطر وضع کیا گیا ہے۔

جماعتی نظام کی تطہیر

تربیت کے اس پورے عملی نظام کی حیثیت، جس کی تفصیل اوپر بیان ہوئی، ایجابی قسم کی ہے، اور تربیت فی الواقع نام ہی ایک ایجابی عمل کا ہے۔ لیکن جہاں تک تربیت کی غرض و غایت کا تعلق ہے وہ چاہتی ہے کہ اسے صرف حاصل ہی نہ کیا جائے، بلکہ حاصل ہونے کے بعد اس کی حفاظت بھی کی جائے۔ اس لیے تحریک اسلامی نے تربیت کی ان ایجابی تدابیر کے ساتھ ایک سلبی

نوعیت کی تدبیر بھی اختیار کررکھی ہے، جواس حفاظت کے نقطۂ نظر سے ضروری تھی اور وہ یہ کہ اگر کوئی رکن اصلاح وتربیت کی ساری تدبیروں اور کوششوں کے باوجود پستی کا شکار رہتا ہے اور ایمان وعمل کی اس سطح سے بھی نیچے گر جاتا ہے، جوایک اسلامی تحریک کی رکنیت کے لیے بالکل ہی ناگزیر ہے، تو اس کی رکنیت ختم کردی جاتی ہے اوراسے جماعتی نظام سے باہر رہ کر اپنی اصلاح کر لینے کا مشورہ دے دیا جاتا ہے۔ اس غرض کے لیے دستور کے اندران وجوہ کی پوری وضاحت اور تعیین کردی گئی ہے، جوکسی شخص کی رکنیت ختم کردیے جانے کی موجب ہوتی ہے۔

خام کارلوگوں سے جماعتی نظم کو پاک کرتے رہنے کا یہ عمل صرف ایک معروف اصول ہی کی پیروی میں نہیں ہے، بلکہ تربیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے بھی ہے اور دومختلف پہلوؤں سے ہے: اس پہلو سے بھی کہ تربیت کی غرض وغایت کو خام کارلوگ بُری طرح متأثر کرکے رکھ دیں گے اورتحریک کے حق میں گواہ بننے کے بجائے اس کے خلاف مجسم دلیل بن جائیں گے اور اس پہلو سے بھی کہ ان کی چھوت دوسرے صالح عناصر کو بھی لگ سکتی ہے، یعنی یہ دیکھ کر کہ ایمان و عمل اور سیرت وکردار کی ان پستیوں کے باوجود تحریک اسلامی کی رکنیت کا شرف باقی رہتا ہے، دوسرے افراد بھی فریب نفس کا شکار ہوکر نیچے کی طرف گر سکتے ہیں۔

تحریک اسلامی اور موجودہ نظام اجتماعی

ضروری سوال

دوسری تحریکوں کے بارے میں یہ سوال یا تو پیدا ہی نہیں ہوتا، یا پیدا ہوتا بھی ہے تو اس کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہوتی۔ مگر ایک ایسی اسلامی تحریک کے بارے میں، جو زندگی کے پورے نظام کو بدل کر از سر نو تعمیر کرنا چاہتی ہو، یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ ملک کے نافذ الوقت نظام سے اس کے ربط و تعلق کی نوعیت کیا ہوگی؟ اس کے ساتھ وہ کیا عملی رویہ اختیار کرے گی؟ اس لیے ''تحریک اسلامی ہند'' کے سلسلے میں اس مسئلے کو بھی ضروری وضاحت سے سمجھ لینا چاہیے۔

یہ مسئلہ چونکہ ایک سیاسی اور اجتماعی نظام سے تعلق کا ہے، اس لیے اس پر غور و بحث کا صحیح طریقہ بدیہی طور پر یہ ہوگا کہ پہلے اس نظام کے بنیادی تصورات کو واضح اور متعین طور سے سامنے رکھ لیا جائے، پھر یہ دیکھا جائے کہ ان کے مقابلے میں اس تحریک کے اپنے سیاسی تصورات کیا ہیں اور ان کی نوعیت اور حیثیت کیا ہے۔ اس تقابلی مطالعے کے بعد یہ معلوم کرنا بالکل آسان ہو جائے گا کہ زیر بحث سوال کا جواب کیا ہوگا۔

موجودہ نظام سیاست کی نظریاتی بنیادیں

ہمارا موجودہ نظام، سیاست و اجتماع کے جن بنیادی اصولوں پر قائم ہے وہ یہ ہیں:

(۱) انسانی حاکمیت

یعنی یہ کہ ملک کے باشندے اپنے حاکم اور مقتدر اعلیٰ خود ہیں۔ وہی اقتدار اور قانون

سازی کا سرچشمہ ہیں۔ اپنے لیے زندگی کا نظام اور آئین وقانون بنانے میں کسی بھی دوسری ہستی کی سند (اتھارٹی) اور مرضی کے پابند ہیں اور نہ کسی اور کے سامنے جوابدہ۔ ہر معاملے میں آخری سند وہ خود ہیں۔

(۲) جمہوریت

(ڈیماکریسی) یعنی یہ کہ اپنی زندگی کا نظام اور آئین وقانون خود وضع کرنے کا یہ حق وہ عملاً جس طرح استعمال کرتے ہیں، وہ انتخابی نمایندگی کا طریقہ ہے۔ وہ اپنا حق حاکمیت اپنی آزاد مرضی سے اپنے منتخب نمایندوں کے سپرد کردیتے ہیں، جو ان کی طرف سے ان کی منشا کے مطابق ملک کے لیے قانون بناتے اور اس کا نفاذ کرتے ہیں۔

(۳) نامذہبیت

(سیکولرزم) یعنی یہ کہ عوام کے یہ منتخب نمائندے آئین وقانون بنانے میں کسی مذہب اور خدائی ہدایت کو بنیاد اور سند تسلیم نہیں کرتے، بلکہ اس بارے میں تمام تر اپنی عقل اور اپنی صوابدید کو سامنے رکھتے ہیں اور ضروری ہے کہ ایسا ہی کریں، یعنی مذہب کو کم از کم سیاسی اور اجتماعی معاملات سے قطعاً باہر رکھیں۔ البتہ اپنے مخصوص دائرے میں وہ اس حد تک آزاد ہے، جس حد تک ملکی امن وامان اور عوامی اخلاق پر اس کی کوئی زد نہ پڑتی ہو۔ اس طرح آزادی کا یہ دائرہ واضح طور پر مذہبی عقائد، عبادات اور رسوم تک محدود ہے۔ ان کے سوا انسانی زندگی کا ہر معاملہ اور ہر مسئلہ اسٹیٹ کے دائرہ بحث اور اختیار کی چیز ہے۔ حتیٰ کہ وراثت اور نکاح وطلاق تک کے معاملات بھی مذہبی دائرے کی چیز نہیں رہ جاتے۔ غرض یہ فیصلہ بھی کہ زندگی کا کون سا معاملہ مذہبی ہے اور کون سا نہیں، مذہب کے اپنے اختیار کی بات نہیں ہے، بلکہ فیصلے کا پورا اور قطعی حق صرف اسٹیٹ اور اس کے آئین[۱] کو ہے۔ جہاں تک مختلف مذاہب کے ساتھ حکومت کے طرز عمل کا تعلق ہے، اصولی طور پر وہ ان کے بارے میں غیر جانب دار رہنے کی اور اکثریتی مذہب یا اقلیتی مذہب

[۱] مثال کے طور پر خود اپنے ہی ملکی دستور کو لے لیجیے۔ ایک طرف تو وہ مذہبی آزادی کا اعلان کرتا ہے دوسری طرف یکساں سول کوڈ بنانے کی بھی ہدایت دیتا ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ کسی بھی ملّت کے اپنے مخصوص پرسنل لاء کے وجود و بقا کا مخالف ہے اور اس مخالفت کو اپنی عطا کردہ مذہبی آزادی کے خلاف نہیں سمجھتا۔ حالانکہ کم از کم ملّت اسلامیہ کے لیے اس کے پرسنل لاء کا جزو دین ہونا ایک بدیہی حقیقت ہے۔

کی اصطلاح میں نہ سوچنے کی پابند ہے، اسے سب کے ساتھ یکساں سلوک اور سب کا یکساں احترام کرنا ہے، (یہ الگ سوال ہے کہ وہ اس اصول کی عملی پیروی کس حد تک کرتی ہے)

اسلام کے بنیادی سیاسی تصورات

موجودہ نظام کے مقابلے میں اسلامی نظام کے اور اس لیے تحریک اسلامی کے بھی، بنیادی سیاسی اصول یہ ہیں:

(۱) اللہ کی حاکمیت

یعنی یہ کہ پوری انسانی زندگی کا حقیقی حاکم اور مقتدر اعلیٰ اللہ تعالیٰ ہے۔ کیونکہ نوع انسانی جس کائنات کا ایک جز ہے، اس کا خالق اور پروردگار اللہ ہی ہے، اس لیے اس کائنات کا اور اس نوع انسانی کا مالک اور حاکم بھی فی الواقع وہی ہے اور حاکمیت کا حق اور اقتدار اعلیٰ اسی کے لیے مخصوص ہے۔ وہی ہے جو اصلاً اسے اس کی زندگی کا نظام دے سکتا ہے اور آئین وقانون بنا سکتا ہے۔ دوسرا کوئی بھی اسے بطور خود حکم دینے کا مجاز نہیں، دوسرا کوئی بھی اس کا حقیقی فرماں روا اور قانون ساز نہیں اور دوسرا کوئی بھی اس کا مُطاعِ مطلق نہیں۔

(۲) انسان کی خلافت

یعنی یہ کہ انسان اس دنیا میں اپنے حاکم حقیقی (اللہ تعالیٰ) کا خلیفہ اور نائب ہے۔ وہ بجائے خود کوئی اقتدار نہیں رکھتا، بلکہ اپنے اور اس پوری کائنات کے اصل مالک و مقتدر اعلیٰ کے عطا کیے ہوئے اقتدار و اختیار کا صرف امین ہے۔ اس کی اصل حیثیت یہ ہے کہ اپنے اختیار کو جو اس کے اسی حاکم حقیقی کا عطا کیا ہوا ہے، اس کی مرضی اور منشا کے مطابق استعمال کرے اور اپنی زندگی کا طور طریق اور نظام وہ بنائے جسے اس کی پسند اور منظوری کی سند حاصل ہو۔ اس کے انفرادی و اجتماعی افکار و اعمال اس کی ہدایات کے تحت ہوں۔ اس بارے میں سارے انسان برابر کے ذمہ دار ہیں اور اپنی حدود میں سبھی کو یہ فرض انجام دینا ہے۔ جہاں تک اس فرض کے سیاسی دائرے میں انجام دینے کا تعلق ہے، اسے وہ بھی عملاً اپنے منتخب نمائندوں ہی کے ذریعہ انجام دیں گے، جس طرح کہ جمہوریت میں ہوتا ہے۔ مگر یہ منتخب نمائندے جمہوری نظام کے نمائندوں

کی طرح اپنے فرائض بجالانے میں آزاد اور خودمختار نہیں ہیں، بلکہ خدائی احکام و ہدایات کے پابند ہیں۔ یوں کہیے کہ انھیں فی الواقع مرضی اپنے مالک حقیقی کی پوری کرنی ہوتی ہے۔ 'عوام' اور 'جمہور' کی نہیں۔

(۳) شریعت کا قانون

یعنی یہ کہ انسانی زندگی کے لیے جو آئین وقانون درکار ہے، وہ اصلاً کسی شخص یا کسی مجلس قانون ساز کے بنانے کا محتاج نہیں ہے۔ بلکہ حقیقی مالک و حاکم نے اسے اصولی حد تک اپنے پیغمبروں کے ذریعہ خود عطا فرما رکھا ہے، جیسا کہ اس کے مالک وحکمراں ہونے کا منطقی تقاضا بھی تھا۔ انسان کو اس قانون خداوندی کی بلاچوں وچرا پیروی کرنی ہے اور کسی تقسیم وتفریق کے بغیر اس پورے مجموعۂ قوانین کو اپنی پوری انفرادی واجتماعی زندگی پر نافذ کرنا ہے۔ وہ اس کے بجائے کوئی اور قانون نہ بنا سکتا ہے نہ اس کی پیروی کرسکتا ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو اپنی حقیقی حیثیت (خلافت الٰہی کی حیثیت) سے انحراف کا اور اپنے مالک سے بغاوت کا مجرم ٹھہرے گا۔ البتہ جن تفصیلی مسائل کے بارے میں شریعت کا کوئی واضح قانون موجود نہ ہو، یا تمدنی ارتقاء کے باعث جو نئے مسائل پیدا ہوتے رہتے ہیں، ان کے بارے میں وہ باہمی مشاورت سے قوانین بنا سکتا ہے، بلکہ ضرور بنانا چاہیے۔ مگر اس سلسلے میں بھی قطعی ضروری ہے کہ شریعت کے مقاصد، اس کے اصلی مزاج، اس کے بنیادی اصول اور اس کے اساسی قوانین کو سامنے رکھا گیا ہو۔ یعنی بوقت ضرورت یہ تفصیلی قانون سازی بھی شریعت الٰہی سے آزاد ہو کر نہیں، بلکہ اس کے تحت ہی کی جاسکتی ہے۔[1]

یہ تو ہوا اسلام کے سیاسی نظام کے بنیادی اصولوں کا تعارف۔ اب ان اصولوں کی حیثیت بھی جان لینی چاہیے۔ ان کی حیثیت نظریے کی نہیں، بلکہ عقیدے کی ہے۔ یہ اصول علمی اور فکری اصول نہیں ہیں، بلکہ دینی اصول ہیں۔ ان کی پیروی اسلام پر ایمان رکھنے والوں کی صرف ایک عقلی ضرورت نہیں ہے، بلکہ شرعی ضرورت ہے۔ ان کا اتباع صرف دنیوی نتائج ہی کا نہیں بلکہ اخروی نتائج کا بھی حامل ہے اور ان کو پس پشت ڈال دینا صرف معقولیت اور اصول پسندی ہی سے نہیں، دین اور خداپرستی سے بھی انحراف ہے۔

---

[1] تفصیل معلوم کرنے کے لیے دیکھیے "بناؤ بگاڑ" اور "اسلامی نظام حیات"۔

تحریک اسلامی کی نظر میں موجودہ نظام کی حیثیت

موجودہ نظام سیاست و اجتماع اور اسلامی نظام ، دونوں کے ان بنیادی اصولوں و تصورات کو بالمقابل رکھ کر دیکھیے تو صاف نظر آئے گا کہ ان میں مشرق ومغرب کی دوری اور واضح تضاد ہے۔یقینی طور پر یہ تضاد کوئی معمولی اور محدود نوعیت کا نہیں ہے، بلکہ ایسا بھاری تضاد ہے جو موجودہ نظام جمہوریت کو اسلام کے صرف سیاسی نظام ہی کی نہیں ، بلکہ تقریباً اس کے پورے ہی نظام زندگی کی ضد بنا کر رکھ دیتا ہے۔ پھر اس امر واقعی کے پیش نظر تو یہ تضاد اپنی انتہاء کو پہنچ جاتا ہے کہ جمہوریت کے ان سیاسی اصولوں اور نظریات کی بنیاد پر قائم ہونے والا اسٹیٹ اب اپنے عمل دخل کا دائرہ اتنا وسیع کرتا جارہا ہے کہ انسانی زندگی کے قریب قریب سبھی شعبے اس کی گرفت میں آچکے ہیں حد یہ ہے کہ وہ عقائد وعبادات تک پر بھی اپنی پرچھائیاں ڈال دینے کے درپے ہے۔ایسی حالت میں تحریک اسلامی کے لیے اصولی ، اخلاقی اور دینی ہر حیثیت سے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں رہ جاتی کہ یہ اس نظام سے سازگاری کر سکے اور اسے گوارا کرنے پر آمادہ ہو سکے ۔ کیونکہ ایسا کرنے کے معنی تو بداہۃً یہ ہوں گے کہ یہ اپنے عمل سے اپنی تکذیب خود ہی کر ڈالے اور اپنے آپ کو ختم کر کے رکھ دے ، یا کم از کم یہ کہ اب وہ اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی تحریک ہرگز نہ رہ جائے۔اس کا اقامت دین کا نصب العین رکھنے والی تحریک ہونا تو اس بات کو لازم کرتا ہے کہ وہ موجودہ نظام کو یکسر غلط اور خلاف حق سمجھے۔صرف سمجھے ہی نہیں ، بلکہ اس کا برملا اعلان کرے ، معقولیت اور دلائل کے میدان میں اسے نہتا اور بے بس کر ڈالے اور خدا کے بندوں پر اس کی خرابیاں واضح کر کے انہیں اسے بدل ڈالنے کے لیے بے چین کر دے۔

یہی وجہ ہے کہ وہ ان الیکشنوں میں شرکت کو بالکل ناجائز سمجھتی ہے جو اس نظام کو چلانے کے لیے لڑے جاتے ہیں اور جب کبھی وہ ان میں شرکت کرے گی تو اس نظام کو نظام اسلامی سے بدل ڈالنے یا اس کے لیے راستہ ہموار کرنے کی غرض سے کرے گی۔کسی معنی میں بھی اسے غذا پہنچانے کے لیے ہرگز نہ کرے گی۔

رضا کارانہ تعاون سے اصولی معذوری

جب موجودہ نظام کے معاملے میں تحریک اسلامی کا اصولی موقف یہ ہے تو اس کے

ساتھ اس کے ارکان کا عملی رویہ بھی قدرتی طور پر دلی تعاون کا نہیں عدم تعاون ہی کا ہوسکتا ہے، اور ان کے لیے اس بات کی کوئی گنجائش نہیں ہوسکتی کہ وہ اپنے دل کی رضا مندی سے اس کے کل پرزے بن کر رہیں، اس کی عدالتوں میں جج اور مصنف بن کر بیٹھیں، اس کے تعلیمی مقاصد کی تکمیل کے لیے اپنی علمی و تدریسی صلاحیتیں وقف کردیں۔ کیونکہ ایک سیکولر جمہوری نظام کو چلانا اور اس کی مشینری میں فٹ ہوجانا، دیانت اور معقولیت کا کام صرف اسی شخص کے لیے ہوسکتا ہے جو اس کے بنیادی اصولوں پر ایمان رکھتا ہو اور اسے ایک صحیح نظام تسلیم کرتا ہو، ان لوگوں کے لیے ہرگز نہیں ہوسکتا جو اسے صحیح نہیں بلکہ غلط اور فاسد سمجھتے ہوں اور اگر کوئی شخص اسے غلط اور فاسد سمجھتے اور کہتے ہوئے بھی اس کے چلانے میں رضا کارانہ طور پر مددگار بنتا ہے تو اسے بدترین قسم کا منافق، یا پھر بدترین قسم کا ضمیر فروش ہی کہا جائے گا۔ چنانچہ آپ نہ دیکھیں گے کہ کوئی سچا کمیونسٹ کسی 'بورژوائی' نظام کو چلانے کے لیے اپنی صلاحیتوں کا سودا کررہا ہے، یا کوئی سچا جمہوریت پسند کسی آمرانہ نظام کے قیام و استحکام کی خدمت بجالا رہا ہے اور اگر کوئی ایسا کرتا ہے تو ساری دنیا اسے بے ضمیر اور ابن الوقت ہی قرار دیتی ہے۔ پھر ایک مومن و مسلم ـــــ تحریک اسلامی کے علمبردار اور اقامت دین کا مشن رکھنے والے مومن و مسلم ـــــ کا معاملہ تو دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ اہم ہے۔ دوسروں کے لیے اشتراکیت اور جمہوریت صرف رائے، نظریے اور ضمیر کا مسئلہ ہیں، جب کہ ایک مسلمان کے لیے اقامت دین عقیدے، دینی فریضے اور مقصدِ وجود کا مسئلہ ہے۔ ایک اشتراکی اگر سرمایہ دارانہ نظام کی یا ایک جمہوریت پسند اگر آمریت کا گاڑی کھینچنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے تو صرف اپنے ضمیر کو قربان کرتا ہے اور دنیا کی رسوائی مول لیتا ہے، لیکن ایک مسلمان اگر کسی فاسد اور غیر اسلامی نظام کا بخوشی پرزہ بن جاتا ہے تو اپنے ضمیر ہی کا نہیں اپنے ایمان کا بھی خون کردیتا ہے اور صرف دنیا ہی کی نہیں، بلکہ آخرت کی بھی رسوائی خرید لیتا ہے۔ جب معاملے کی نوعیت یہ ہے تو نہ تحریک اسلامی کے ارکان ہی کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی دنیوی مصلحت یا معاشی مفاد کے تحت اس جمہوری نا مذہبی اسٹیٹ کو چلانے میں رضا کارانہ طور پر حصہ دار بنیں، نہ دوسروں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ان سے اس طرح کی توقع رکھیں اور اگر کوئی شخص اس حصہ داری کے لیے آمادہ ہوجاتا ہے تو وہ اپنے کو چاہے جو کچھ بھی سمجھتا رہے، تحریک اقامت دین کا علم بردار تو ہرگز نہیں رہ سکتا۔

پھر اس رضا کارانہ تعاون کے مسئلے کو ایک اور پہلو سے بھی دیکھیے۔ تحریک اسلامی کا مقصد اسلامی نظام کا قیام ہے۔ اس کے لازمی معنی یہ ہیں کہ وہ موجودہ کارفرما نظام کو بدل ڈالنے کی سعی و جہد میں کوئی کسر اٹھانہ رکھے گی۔ کیونکہ جب تک کارفرمائی کا منصب اس نظام سے خالی نہ کرالیا جائے کسی اور نظام کے اس پر فائز ہوسکنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اس واضح حقیقت کے ہوتے ہوئے، یقینی بات ہے کہ تحریک اسلامی کے ارکان اس نظام سے رضا کارانہ تعاون کی بات سوچ بھی نہیں سکتے۔ کیونکہ کسی سے رضا کارانہ تعاون لازمی طور پر اس کے وجود کی تقویت اور اس کے مقاصد کی تائید و تکمیل کا موجب ہوا کرتا ہے۔ اس لیے موجودہ غیر اسلامی نظام سے رضا کارانہ تعاون اسے زندگی اور اقتدار کی مسند سے ہٹا دینے کا نہیں، بلکہ اس کے قدموں کو مضبوطی سے جما دینے یا جمائے رکھنے ہی کا باعث بنے گا اور لازماً بنے گا۔ حالانکہ تحریک اسلامی کے ارکان وہ لوگ ہیں، جنھوں نے خلق کے سامنے یہ اعلان اور خالق کے سامنے یہ عہد کر رکھا ہے کہ وہ اپنی ساری توانائیاں اسلامی نظام کے قیام کے لیے وقف کیے رہیں گے۔ ایسی حالت میں اگر وہ موجودہ غیر اسلامی نظام کی جڑوں کی، اپنے دلی تعاون اور اپنی خدمات سے آبیاری کرتے ہیں تو کوئی شک نہیں کہ وہ نہ اپنے اس اعلان میں مخلص وصادق قرار پائیں گی اور نہ اپنے اس عہد کے وفادار ٹھہر سکیں گے۔ کیونکہ یہ نظام، اسلامی نظام کا بہرحال حریف ہے اور اس کی ترقی واستحکام کا ایک قدم اس کی اقامت کے امکان کو دس قدم پیچھے دور پھینک دے سکتا ہے۔ اس لیے اگر کوئی شخص اسلامی نظام کے قیام کی خواہش اور جدوجہد میں فی الواقع مخلص اور یکسو ہے اور اس نے سچے دل سے اسے اپنا نصب العین بنا رکھا ہے، تو اس کا موقف، فطری اور بدیہی طور پر، اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ وہ نظام حاضر کے ساتھ رضا کارانہ تعاون کا خیال تک دل میں نہ لائے۔

غرض یہ دونوں ایسے اصولی موانع ہیں جو موجودہ نظام کی رضا کارانہ خدمت و معاونت سے دور رہنے کو تحریک اسلامی کے ارکان کی ایک اصولی، فطری اور ایمانی ضرورت قرار دیتے ہیں اور انتہائی ضروری ہے کہ اسے ایسا ہی سمجھا بھی جائے۔ بڑا ظلم ہوگا اگر اس کے پیچھے کچھ دوسرے عوامل ڈھونڈے جائیں، اسے کج فکری یا مذہبی کٹر پن کا نتیجہ خیال کرلیا جائے، یا تحریک اسلامی کی

پالیسی سمجھ لیا جائے، جو محض کچھ مصالح اور حالات کے تحت بنائی گئی ہو۔ نہیں، یہ نہ کسی پالیسی کا مسئلہ ہے، نہ کسی مصلحت یا کسی مذہبی ذہنیت کا، بلکہ سرتاسر اصول کا مسئلہ ہے۔

موجودہ نظام سے رضاکارانہ تعاون نہ کرسکنے کی یہی اصولی مجبوری ہے جس کی بنا پر 'تحریک اسلامی' اپنے ارکان کے لیے اس کی ملازمتوں کے دروازے قریب قریب بند ہی پاتی ہے۔ چنانچہ اس نے ضروری قرار دے رکھا ہے کہ وہ ایسی ملازمتوں سے تو لازماً دور رہیں جن میں کھلی ہوئی معصیتوں کا ارتکاب کرنا پڑتا ہے اور باقی ملازمتوں کو بھی بدرجۂ مجبوری ہی گوارا کریں۔ کیونکہ ان ملازمتوں میں اگرچہ بظاہر کسی محذور شرعی کا ارتکاب نہیں کرنا پڑتا اور خالص فقہی نقطۂ نظر سے انھیں چاہے جائز ہی کہا جاسکتا ہو، مگر ان سب کے باوجود آخر یہ ملازمتیں تو ہیں، بہرحال اسی نظام فاسد کی خدمت اور عملی اعانت جس کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلام کا نظام صالح قائم کرنے کا یہ لوگ عہد کیے ہوئے ہیں۔ اس لیے چاہے ان ملازمتوں میں کسی امر معصیت کا براہ راست ارتکاب ذرہ برابر بھی نہ کرنا پڑتا ہو (جس طرح کہ شراب اور سود وغیرہ جیسی چیزوں کے کاروبار سے تعلق رکھنے والی ملازمتوں میں لازماً کرنا پڑتا ہے) لیکن ایک غلط نظام کی خدمت ہونے کے باعث وہ بھی بالواسطہ قباحت سے، خواہ وہ کتنی ہی معمولی کیوں نہ ہو، پاک یقیناً نہیں رہ جاتیں اور جب وہ قباحت سے پاک نہیں رہ جاتیں تو ان کے لیے پسندیدہ اور قابل اختیار بھی نہیں ہوسکتیں۔ آپ جس دیوار کو گرانا چاہتے ہیں، اس کے لیے صرف اینٹ اور گارے ہی نہیں، پلاسٹر اور سامان آرائش کا مہیا کرنا بھی ایک نامعقول حرکت ہی سمجھیں گے۔ اس لیے ان لوگوں کو جو یہاں کے موجودہ نظام فاسد کو ہٹا کر اس کی جگہ اسلامی نظام حق قائم کرنے کا عہد کیے ہوئے ہیں، یہ بات کس طرح زیب دے سکتی ہے کہ وہ اسی فاسد نظام کے خدم وحشم میں، ان کی آخری صفوں ہی میں سہی، شامل ہوں؟ ان کا کام تو اسے پیہم کوششوں کے ذریعہ بدل کر رکھ دینا ہے، اس کی بقا کا سہارا بننا، خواہ وہ کتنا ہی معمولی کیوں نہ ہو، ہرگز نہیں ہے۔

ملکی قوانین کی عملی پابندی

موجودہ نظام کو اصولی اور اعتقادی طور پر غلط، فاسد اور قابل رد قرار دینے کے باوجود جہاں تک اس کے عام قوانین ملکی کا تعلق ہے، تحریک اسلامی اس بات کو صحیح نہیں سمجھتی کہ عملاً بھی ان

کو رد کر دیا جائے۔ چنانچہ اس بارے میں اس کی ہدایت یہ ہے کہ ان قوانین کو اصلاً غلط اور باطل سمجھنے کے باوجود عملی پابندی ان کی ضرور کی جائے، الّا یہ کہ کوئی قانون ہی ایسا ہو جس کی پیروی سے شریعت کی کھلی ہوئی خلاف ورزی اور اللہ و رسول کی راست نافرمانی لازم آتی ہو۔ عام ملکی قوانین کی عملی پابندی کا یہ مسلک اس نے کسی مصلحت یا سیاسی ضرورت کی بنا پر نہیں اختیار کیا ہے، بلکہ اسوۂ انبیا کی روشنی میں اختیار کیا ہے۔ اس اسوئے سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی غلط نظام بھی جب تک قائم اور نافذ ہو، اس وقت تک اس کے عام قوانین کی عملی پابندی سے انکار نہیں کرنا چاہیے۔ یہ اصول اس وقعیت پسندی پر مبنی ہے کہ انسان کی اجتماعی زندگی بہر حال کوئی نہ کوئی ضابطہ اور قانون چاہتی ہے۔ اس کے بغیر وہ قائم ہی نہیں رہ سکتی۔ اب اگر وقت کے کارفرما قوانین کی پابندی ترک کر دی جائے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ زندگی یا تو جامد ہو کر رہ جائے گی یا پھر اس میں نظم وضبط باقی نہ رہ جائے گا۔ پہلی صورت عملاً ناممکن ہے اور دوسری سرتاسر انتشار، انارکی اور فتنہ وفساد کے ہم معنی ہے، اس لیے وہ بھی قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ غلط سے غلط اور بد سے بد تر قوانین وضوابط کی حکمرانی بھی انسانی زندگی کے عمومی مصالح کے لیے انارکی اور لاقانونیت سے بہر حال کم تر درجے کی مصیبت ہے۔ اس لیے شریعت اسلامی کا نقطۂ نظر اس باب میں بجا طور پر یہ ہے کہ ایک زیادہ سخت اور تباہ کن مصیبت سے بچنے کے لیے کسی باطل نظام غالب کے قوانین کی پابندی کی نسبۃً چھوٹی مصیبت کو لازماً گوارا کیا جائے۔

موجودہ قوانین ملکی کے بارے میں اس نقطۂ نظر سے ایک اور بڑی اہم حقیقت بھی سامنے آجاتی ہے اور وہ یہ کہ تحریک اسلامی کے افراد موجودہ قوانین ملکی کو اگرچہ اصلاً غلط اور باطل سمجھتے ہیں، مگر اس کے باوجود ان کی عملی پابندی جتنے اچھے اور قابل اعتماد طریقے پر وہ کریں گے، اتنے قابل اعتماد طریقے پر خود اس نظام کے ماننے والوں سے بھی شاید نہ ہو سکے گی۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ اگر ان قوانین کا پاس ولحاظ کریں گے تو اس کے پیچھے جذبہ ومحرک یا تو سزا کا خوف ہوگا یا زیادہ سے زیادہ اپنے ضمیر کا احساس ہوگا، لیکن جب تحریک اسلامی کے افراد یہی رویہ اختیار کریں گے تو اس کے پیچھے محرک ایک دینی اصول کا احترام اور ایک شرعی ہدایت کی بجا آوری کا خیال ہوگا اور معلوم ہے کہ اپنی گہرائی اور پختگی میں کوئی بھی دوسرا محرک اس دینی محرک کا ہرگز مقابلہ نہیں کرسکتا۔ بالخصوص جب معاملہ بھی ایسے افراد کا ہو جو دین وشریعت کی عملی شہادت ہی کو اپنی زندگی کا

مشن بنائے ہوئے ہوں، جو قول اور فعل کے تضاد کو اپنی اور اپنے مشن کی تباہی یقین کرتے ہوں اور جن کی راست بازی اور ظاہر و باطن کی یکسانی ہی پر اپنے تحریکی مقاصد کی کامیابی موقوف ہو۔

موجودہ نظام کے خلاف عملی جدو جہد کا طریقہ

جب یہ معلوم ہو چکا کہ تحریک اسلامی نہ صرف یہ کہ موجودہ نظام سے کسی طرح کی ساز گاری نہیں کر سکتی، بلکہ وہ اسے پوری طرح بدل دینا چاہتی ہے، تو اب یہ بھی جان لینا مناسب ہوگا کہ یہ کام وہ کس طرح کرنا چاہتی ہے؟ اس کام کے بنیادی خطوط چند لفظوں میں یہ ہیں:

(۱) اسلامی نظام کی معقولیت اور ہمہ جہتی برتری کی ہر ضروری پہلو سے وضاحت، جس کی مختصر تفصیل درج ذیل ہے:

● اس نظام کی بنیادوں ـــــــ وحدتِ الٰہ، وحدت آدم، رسالت محمدی، اور آخرت ـــــــ کو وقت کی زبان میں مؤثر دلائل سے برحق ثابت کرتے ہوئے واضح کر دیا جائے کہ یہ کائنات اور حیات انسانی کے فطری اور بنیادی حقائق ہیں۔

● اس کی فطری صلاحیتوں کو پوری طرح روشنی میں لا کر تفصیل سے بتا دیا جائے کہ زندگی کے مختلف مسائل کو وہ پوری کامیابی کے ساتھ حل کر سکتا اور انسانیت کو وقت کی گوناگوں پیچیدگیوں سے نجات دلا سکتا ہے۔

● اس کی عملی برکتوں کی تاریخی شہادتوں کا ریکارڈ دنیا کے سامنے رکھ دیا جائے تاکہ وہ دیکھ لے کہ انسانی زندگی پر جب بھی یہ نظام نافذ ہوا ہے، وہ عدل اور احسان سے، اخوت اور جذبہ انسانیت سے، حق شناسی اور احساس ذمہ داری سے، نیکی اور خیر پسندی سے آراستہ ہو گئی ہے اور اس میں امن و سلامتی اور خوشحالی کی بہار آ گئی ہے اور ان سب باتوں کے نتیجے میں دنیا کا سب سے بہتر، صالح اور مثالی تمدن وجود میں آ گیا ہے۔

(۲) موجودہ نظام کی ہر ضروری پہلو سے تنقید و تردید، جس کے اہم نکتے حسب ذیل ہیں:

● اس نظام کے اساسی افکار و نظریات پر خالص علمی انداز میں تنقید کر کے واضح کر دیا جائے کہ وہ بالکل غلط، غیر ثابت شدہ اور باطل ہیں اور فکر و عمل کے ٹھوس حقائق سے ان کا کوئی تعلق نہیں۔

● اس کی فطری صلاحیتوں کا تفصیلی جائزہ لے کر یہ حقیقت نگاہوں کے سامنے رکھ دی

جائے کہ بگاڑ اور بدانجامی اس کی عین سرشت میں داخل ہے اور اس سے یہ توقع رکھنا، کہ وہ انسانیت کو فلاح اور زندگی کو اس کے الجھے ہوئے مسائل کا کوئی اطمینان بخش حل عطا کر سکے گا، اپنے کو فریب دینا ہے۔

● اس کی عملی کارگردگی پر واقعات کی شہادتیں پیش کر کے واضح کر دیا جائے کہ اس نے انسانیت کو بالعموم کڑوے کسیلے پھل ہی فراہم کیے اور زندگی کو بے چینیوں، بدکرداریوں اور فتنوں ہی کے تحفے عطا کیے ہیں اور نوع انسانی کے لیے وہ آج تک کبھی سچی فلاح کا موجِب نہیں بن سکا ہے۔

یہ ہیں وہ مثبت اور منفی بنیادی خطوط، جن پر تحریک اسلامی نے موجودہ نظام سے لڑنے کا نقشہ کار بنا رکھا ہے اور منطقی طور پر یہی خطوط ہو بھی سکتے ہیں، جن کے مطابق کام کر کے وہ اس نظام کی نظریاتی گرفت سے باشندگان ملک کے ذہنوں کو آزاد کرا سکتی اور پھر نظام اسلامی کے حق میں انہیں مطمئن کر سکتی ہے، چنانچہ اپنے ابتدائی دور ہی سے وہ اسی نہج پر جدو جہد کرتی چلی آ رہی ہے اور آیندہ بھی کرتے رہنے کا عزم رکھتی ہے۔

مخالفتوں کا محاذ

مخالفتوں کا لازمی ظہور

تاریخ کا بیان ہے کہ آج تک کوئی بھی انقلابی تحریک مخالفتوں سے بچ کر اپنا سفر جاری نہیں رکھ سکی ہے اور 'قدیم' سے اندھی محبت کی عام انسانی نفسیات کے پیش نظر ایسا متوقع بھی نہیں تھا۔ جب صورت واقعہ یہ ہے تو ایک اسلامی تحریک اور دینی دعوت ہی کے بارے میں یہ خوش فہمی کیوں رکھی جائے کہ اسے کسی بھی مخالفت سے سابقہ پیش نہ آئے گا؟ کسی بھی مخالفت سے سابقہ پیش نہ آنے کا کیا سوال، اسلامی تحریکوں، بالخصوص انبیائی دعوتوں کی تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ انھیں ایک دو نہیں، بلکہ بے شمار مخالفتوں سے دوچار ہونا پڑا تھا اور جیسی سخت اور ہمہ جہتی مخالفت ان کی کی گئی تھی اس کی نظیر دوسری جگہوں میں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتی۔ فطری طور پر ایسا ہی ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ اسلامی تحریکیں اور دعوتیں دنیا کی وہ واحد تحریک ہوتی ہیں، جو صحیح معنوں میں 'انقلابی' ہوتی ہیں۔ دوسری کسی بھی تحریک کے سامنے انسانی زندگی میں اتنا بنیادی اور اتنا ہمہ گیر تغیر لانا ہرگز نہیں ہوا کرتا، جتنا کہ ان تحریکوں اور دعوتوں کے سامنے ہوا کرتا ہے۔ دوسری طرف اپنے بنیادی اصولوں میں وہ حد درجہ بے لچک بھی ہوتی ہیں۔ حالات سے مصالحت کی وہ کبھی نہیں سوچتیں، زمانہ سازی کی پالیسی سے ان کی فطرت بالکل ناآشنا ہوتی ہے۔ تیسری طرف اپنے پیغام کے بارے میں بھی ان کا دعویٰ صرف صحیح اور حق ہونے کا نہیں، بلکہ تنہا حق ہونے کا ہوتا ہے اور اس کے خلاف جو کچھ ہوتا ہے اسے وہ قطعاً غلط، یکسر باطل اور کلیۃً قابل رد ٹھہراتی ہیں اور اس کا پوری شدت سے اعلان کرنا بھی ضروری سمجھتی ہیں۔ کوئی شک نہیں کہ جو تحریک ایسی بے نیام ہو،

اس کو اپنا سفر جاری رکھنے کے لیے کوئی ٹھنڈی سڑک، ہرگز نہیں مل سکتی اور اسے نہ ماننے والے اسے صرف نہ ماننے ہی پر کبھی بس نہیں کر سکتے۔ اس لیے اگر آج بھی تحریک اسلامی کو ہمہ جہتی طوفانی مخالفتوں سے سابقہ پیش آ رہا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ تعجب تو اس وقت ہوتا جب یہ صورت حال پیش نہ آتی۔

پھر جس طرح ہمہ جہتی مخالفتوں کا ظہور توقع کے عین مطابق ہے، اسی طرح ان کا مسلسل باقی رہنا بھی خلاف توقع نہیں ہے۔ کیونکہ ان مخالفتوں کے جو فطری اور نفسیاتی اسباب ہیں، ان میں سے بیشتر بجائے خود مستقل نوعیت کے ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ ان کی پیدا کی ہوئی مخالفتیں بھی مستقلاً جاری رہیں۔ یہ صحیح ہے کہ تحریک ان کے مقابلے میں صبر و استقامت اور حکمت سے کام لے کر انھیں نیچا دکھا سکتی ہے اور ان کے دائرے کو تنگ کر سکتی ہے۔ مگر اس دائرے کو وہ صرف تنگ ہی کر سکے گی، اسے ختم ہرگز نہ کر سکے گی۔ جیسا کہ ہر دینی تحریک کی سرگزشت شہادت دے رہی ہے، اور سب سے بڑی شہادت قرآنی دعوت کی ہے، جس کے دور آغاز سے لے کر اس کے دور غلبہ و اقتدار تک کوئی لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جس میں وہ مخالفتوں سے یکسر محفوظ رہی ہو۔

اسباب و محرکات

ان سارے اسباب و محرکات کا اگر تجزیہ کیا جائے جن کے تحت آج تحریک اسلامی کی مخالفت کی جا رہی ہے، تو وہ ایک دو نہیں مختلف دکھائی دیں گے۔ کیونکہ مخالفت کرنے والوں کے نہ ذہن ایک سے ہیں، نہ نفسیات و جذبات اور نہ مفادات و مصالح۔ اس لیے ان کی مخالفتوں کے اسباب و محرکات بھی ایک سے نہیں ہو سکتے۔ چنانچہ جائزہ بتاتا ہے کہ یہ اپنی تعداد میں متعدد ہیں، جو اصولی طور پر دو قسموں میں بانٹے جا سکتے ہیں۔

(الف) وہ اسباب جو عام اور ہمہ گیر نوعیت کے ہیں اور تمام گروہوں اور طبقوں کے اندر کارفرما ہیں۔

(ب) وہ اسباب جو مخصوص اور محدود نوعیت کے ہیں اور کسی خاص ملّی گروہ یا کسی خاص طبقے ہی میں پائے جاتے ہیں۔

(الف) عام و ہمہ گیر اسباب

عام و ہمہ گیر اسباب، جو مسلم و غیر مسلم، سماجی اور سیاسی اور عوام و حکمراں، سبھی گروہوں میں اپنا کام کرتے دیکھے جاتے ہیں، حسب ذیل ہیں:

(۱) پہلا سبب ناواقفیت اور غلط فہمی کا ہے۔ ملک میں بے شمار لوگ ایسے ہیں جن تک تحریک کی اصل دعوت اور اس کے اصول و مقاصد ابھی تک صحیح شکل میں پہنچ ہی نہیں پائے ہیں، یا پہنچ پائے ہیں تو وہ انھیں اچھی طرح سمجھ نہیں سکے ہیں۔ اس لیے ظاہر بات ہے کہ وہ اپنی غلط یا ادھوری معلومات کی بنا پر اس کے بارے میں جو رائے قائم کریں گے وہ موافقانہ ہو ہی نہیں سکتی اور اگر ہوگی تو وہ ''تحسین ناشناس'' ہوگی، جسے اگر دعوت کے حق میں مخالفت نہیں تو موافقت بھی نہیں کہا جا سکتا۔

(۲) دوسرا سبب بدگمانی کا وہ روگ ہے جو ہمارے معاشرے میں ہر طرف بُری طرح پھیلا ہوا ہے۔ خصوصاً دینی تحریکوں کے بارے میں تو اس نے وبا کی شکل اختیار کر رکھی ہے۔ جہاں ایسی کوئی تحریک اٹھی، فوراً ہی 'فیصلہ' دے دیا جاتا ہے کہ یہ فریب کا کاروبار ہے، دنیوی جاہ و اقتدار حاصل کرنے کے لیے مذہب کو استعمال کیا جا رہا ہے۔ اس سے انکار نہیں کہ اس طرح کا الزام ہر جگہ بے اصل بھی نہیں ہوتا۔ کیونکہ حضرتِ انسان کے دامن کا ایسی فریب کاریوں اور مذہب فروشیوں سے داغدار ہونا ایک ناقابل انکار حقیقت ہے، مگر اس کا مطلب یہ تو نہیں ہونا چاہیے کہ اب ہر دینی تحریک کو چھوٹتے ہی ڈھونگ قرار دے دیا جائے۔ ایسا کرنا انسانیت کی عظمت اور دیانت و صداقت سب کا خون کرنا ہے۔ مگر افسوس ہے کہ یہ خون بری طرح لوگوں کے منہ لگ گیا ہے۔ اس فضا میں اگر تحریک اسلامی بدگمانیوں کے اس حملے سے بچی رہ جاتی تو یہ ایک ایسا معجزہ ہوتا جو اس زمین پر آج تک کبھی رونما نہیں ہو سکا۔ چنانچہ واقعات بتا رہے ہیں کہ یہ اپنے وقت آغاز ہی سے برابر اس حملے کی زد میں ہے۔

(۳) تیسرا سبب دور جدید کے انسانوں کی وہ مایوسی اور بے اعتمادی ہے، جو نفس مذہب ہی کے بارے میں اس کے اندر گھر کر چکی ہے۔ جدھر دیکھیے، دنیا خدا اور مذہب سے برابر دور بھاگتی چلی جا رہی ہے۔ حد یہ ہے کہ خود مذہب کے پر جوش حامیوں کی بھی ایک بڑی تعداد

اس سے کوئی سنجیدہ، شعوری اور حیات آفریں تعلق نہیں رکھتی اور جہاں تک اجتماعی مسائلِ حیات کے سلسلے میں مذہب کی کسی کامیاب رہنمائی کا تعلق ہے، اس کے بارے میں تو کوئی شعوری یقین اور سچا اعتماد بس خال خال افراد ہی میں موجود رہ گیا ہے۔ 'مذہب' کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں یہ عام بے اعتمادی اسلام اور تحریک اسلامی کے معاملے میں اپنا کردار انجام دینے سے کیسے باز رہ سکتی تھی۔ چنانچہ مذہب سے بے گانہ ہو چکنے والے ہی نہیں، بہت سے اس کے ''دل دادگان'' بھی اس تحریک کے محض اس بنا پر مخالف ہیں کہ وہ ان کے خیال میں چھکڑے کے ذریعے خلا کے سفر کی بات کر رہی ہے۔

(۴) مخالفت کا چوتھا سبب 'دین' اور سیاست کی تفریق کا وہ نظریہ ہے جس نے اس زمانے میں غیر معمولی مقبولیت حاصل کر لی ہے اور جس کے معتقد 'شیخ و برہمن' سبھی ہیں۔ یہ نظریہ اپنے پیچھے کیا دلیلیں رکھتا ہے اور وہ فی الواقع دلیل کہلانے کی مستحق ہیں بھی یا نہیں؟ یہ الگ بحث ہے۔ یہاں گفتگو صرف صورت واقعہ کے بارے میں ہو رہی ہے اور یہ صورت واقعہ سب کی نگاہوں کے سامنے ہے۔ اب یہ نظریہ صرف نظریہ نہیں رہا، بلکہ قریب قریب ایک مسلمہ حقیقت اور شاید عقیدہ بھی بن چکا ہے۔ دنیاداروں اور سیاست کاروں کی تو کوئی بات ہی نہیں، خدا اور مذہب کا دم بھرنے والوں کی بھی عظیم اکثریت عین اپنے دینی تصور کی بنا پر، فکر و نظر کا یہی انداز رکھتی ہے۔ حتیٰ کہ جو لوگ اس کج نگاہی کے شکار نہیں ہیں، بالعموم وہ بھی اس کے آگے سپر ڈال چکے ہیں اور اس کے خلاف زبان کھولنے کی جرأت نہیں کرتے۔ ایسے ماحول میں اس تحریک کی مخالفت لازماً ہونی ہی چاہیے تھی، جو اس عقیدے اور پیغام کے ساتھ میدان عمل میں آئی ہو کہ سیاست اور دین کے خانے الگ الگ نہیں ہیں، بلکہ سیاست بھی دین ہی کا ایک ضروری اور بڑا اہم جزو ہے، جس کے بغیر نہ تو دین کی پیروی کا حق ادا ہو سکتا ہے، نہ انسانی زندگی کی صالح تعمیر ہی ممکن ہے۔ چنانچہ تحریک اسلامی کا یہ اتنا بڑا اور بھیانک ''جرم'' ہے جسے کسی طرح بھی معاف نہیں کیا جا رہا ہے اور باشندگان ملک کی بھاری اکثریت، بالخصوص ان کا سربراہ طبقہ تحریک کو اسی بنا پر فرقہ پرست، رجعت پسند، تنگ نظر، بلکہ گردن زدنی قرار دے رہا ہے کہ وہ ان کی طرح دین و سیاست کی دوئی پر ایمان نہیں رکھتی۔

(۵) پانچواں سبب نفسانیت ہے۔ یعنی یہ کہ دعوت سے پوری طرح واقف ہو جانے

اور اسے برحق جان لینے کے باوجود بھی کچھ لوگ اپنی شر پسندی اور نفسیانیت کی بنا پر اس کی مخالفت پر اپنے کو مجبور پا رہے ہیں۔ کیونکہ اس دعوت کا فروغ ہی نہیں، اس کا اعلان و اظہار بھی ان کی خواہش پرستیوں پر ضرب لگا دینے والا ہے، اس لیے قدرتی طور پر وہ اسے کسی حال میں بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتے۔

(٦) چھٹا سبب یہ خیال یا عقیدہ ہے کہ فی نفسہٖ یہ دعوت ہی غلط اور خلاف حق ہے۔

(ب) مخصوص اور محدود نوعیت کے اسباب

اب ان مخصوص اسباب و محرکات کو لیجیے جن میں سے ہر ایک کسی خاص ملی گروہ یا کسی خاص طبقے ہی تک محدود ہے۔ ان اسباب کی تفصیل یہ ہے:

(ا) پہلا سبب جو مسلم حلقوں سے تعلق رکھتا ہے، وہ مخصوص مذہبی ذہنیت ہے جو ایک مدت سے غیر اسلامی نظاموں کے تحت زندگی بسر کرتے کرتے ان کے اندر پیدا ہو چکی ہے۔ ایک نازک طبع شخص کو بھی اگر کسی بدبودار احاطے میں بند کر دیا جائے تو شروع میں چاہے جتنا بھی اس کا دم گھٹتا اور اسے استفراغ پر استفراغ ہوتا رہے، مگر اس کا یہ احساس اذیت ہمیشہ باقی نہ رہ سکے گا، بلکہ وقت کے گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں لازماً کمی آتی چلی جائے گی، یہاں تک کہ کچھ عرصے بعد وہ اس بدبودار ماحول سے پوری طرح مانوس ہو جائے گا اور اس کے لیے اس میں کوئی تکلیف کی بات بالکل نہ رہ جائے گی۔ حالات کے نفسیاتی دباؤ کا یہی عمل ہے جس نے اسلام کی علم بردار اور حق کی شاہد امت مسلمہ کو آج اپنے آپ سے بیگانہ بنا کر رکھ دیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک صریح غیر اسلامی اور باطل نظام کے زیر سایہ زندگی بسر کرنے پر جیسے قانع و مطمئن ہو بیٹھی ہے۔ نوبت یہاں تک پہنچ چکی ہے کہ مسلم عوام کو کون کہے، اکثر خواص اور ارباب علم دین و دیانت کے دل و دماغ بھی اسلامی نظام کی بے چین آرزوؤں اور حسرتوں سے خالی ہوتے چلے جا رہے ہیں اور اب اس کی حیثیت ان کے نزدیک ایک 'قدیم و متبرک یادگار' سے زیادہ شاید ہی کچھ اور رہ گئی ہے، جس کے خارج کی دنیا میں از سر نو ایک واقعہ بن کر نمودار ہونے کا کوئی سوال ہی نہیں رہا۔ اپنے محبوب و مطلوب نظام حیات کی طرف سے اس حد تک مایوس اور بے پروا ہونے کا قدرتی نتیجہ یہ ہونا ہی چاہیے تھا کہ 'مسلمان' کی ایمانی حس موجودہ نظام غالب کے 'تعفن' کو محسوس نہ

کر پائے اور اس سے اس حد تک مانوس ہو جائے کہ اس کے ''سایۂ عاطفت'' میں اس کی نسلوں پر نسلیں پروان چڑھتی رہیں اور اس کی حصہ داری اور خدمت گزاری میں ذوق وشوق سے مسابقت کرنے لگیں۔ اس نظام کے سحر سے اس حد تک مسحور ہو چکنے کے بعد ان سے اس بات کی توقع کیسے کی جا سکتی تھی کہ وہ تحریک اسلامی کو خوش آمدید کہیں گے۔ موجودہ نظام ان کی آنکھوں میں کانٹا بن کر چبھنے لگے گا اور وہ اسے بیخ وبن سے اکھاڑ پھینکنے کی اور اس کی جگہ نظام حق قائم کرنے کی دعوت کو اپنے دل کی آواز سمجھیں گے، چنانچہ حیرت وافسوس سے دیکھا جا رہا ہے کہ اسلام اور قرآن کے علم برداروں کی ایک بھاری تعداد اس تحریک کو اپنے دل کی آواز سمجھنے کے بجائے اسے ایک 'مصیبت' سمجھ رہی ہے اور اسے پیچھے دھکیل دینے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرنے سے بھی باز نہیں رہتی۔ اگر یہ مشکل پیش آئی کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے اُسوے کی موجودگی دعوت کے نصب العین کو غلط اور اس کے کسی بنیادی نکتے کو بے اصل قرار دینے کی اجازت نہیں دے رہی ہے تو مخالفت کے لیے کچھ خاص پہلو ایجاد کر لیے گئے۔ سامنے سے حملہ نہیں کیا جا سکا تو پیچھے اور دائیں بائیں سے وار کیے جانے لگے۔ کبھی کہا گیا کہ اس زمانے میں اور ایسے ملک میں دین اور اسلامی نظام قائم کرنے کی تحریک تو پریشاں حال ملت کے لیے ایک زبردست سامان ہلاکت ہے، اور وَلَا تُلْقُوْا بِاَیْدِیْکُمْ اِلَی التَّھْلُکَةِ کی ہدایت ربانی کے منافی بھی ہے۔ کبھی فرمایا گیا کہ اس تحریک کے علم بردار اور کارکن قابل اعتماد نہیں ہیں اس لیے اس کا ساتھ دینے کا کوئی سوال ہی نہیں کبھی ارشاد ہوا کہ اسلامی نظام کا قائم ہو جانا دیوانے کا خواب ہے، اس لیے ایک ناممکن مقصد کے لیے اپنی قوتیں ضائع کرنا کوئی ہوش مندی کی بات نہیں کبھی یہ 'سمجھانے' کی کوشش کی گئی کہ اسلامی نظام حکومت کا قیام تو حسن عمل کا انعام ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے صالح بندوں کو عطا ہوا کرتا ہے، کوئی فریضہ یا مطلوب شے نہیں ہے کہ اس کو نصب العین بنا کر جدوجہد کی جائے غرض اس طرح کی ایک دو نہیں، متعدد دلیلیں ہیں جو اس تحریک کی مخالفت میں بڑے زور شور سے پیش کی جا رہی ہیں۔ اور قریب قریب یہ سب نتیجہ ہیں، اسی بیمار مذہبی ذہنیت کا جس کی ابھی نقاب کشائی کی جا چکی ہے۔ یہ ذہنیت اس بات سے تو بہت خوش ہوتی ہے کہ اسلام کے خوب خوب محامد بیان کیے جائیں اور اسے ایک مکمل ضابطہ حیات اور دنیا کا سب سے اچھا، سب سے برتر اور سب سے کامیاب نظام زندگی ثابت کر دینے کے لیے خطابت اور انشاء کے خوب خوب جوہر

دکھائے جائیں، مگر جب اسی اسلام کو اور اسی سب سے مکمل اور کامیاب نظام کو، انسانی زندگی پر غالب اور نافذ کرنے کی کسی عملی جدوجہد کا مطالبہ کیجیے تو اس پر ایک سخت قسم کے انقباض اور برہمی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔[1]

بظاہر اتنی توقع تو کی ہی جاسکتی تھی کہ یہ لوگ اگر خود اپنے اندر اقامت دین کی عملی جدوجہد کے لیے کوئی ہمت نہیں پار ہے ہیں، تو کم از کم خاموش تو ضرور ہی رہیں گے اور آگے

---

[1] اس تحریک کی 'آپ بیتی' میں .... اس حقیقت کی متعدد شہادتیں موجود ہیں۔ جب تک اس نے ایک باضابطہ تحریک کی شکل نہیں اختیار کی تھی، بلکہ ابھی اپنے تمہیدی دور سے گزر رہی تھی اور اس کی سرگرمیاں فکری اور علمی کاوشوں تک ہی محدود تھیں، دین پسند حلقے اسے نصرت دین کا بہترین جہاد قرار دیتے رہے اور لکھنے والے کی تعریف و تکریم میں اچھے سے اچھے جذبات کا اظہار کرتے رہے، لیکن جب بات فکری اور علمی حدود سے آگے بڑھ کر عملی جدوجہد کی دعوت تک پہنچ گئی اور اسلام کو اپنی پوری زندگی کا نظام بنالینے کا قدرتی مطالبہ کانوں سے ٹکرانے لگا تو دیکھتے ہی دیکھتے ہوا کا رخ بدل گیا۔ داد و تحسین کی جگہ اختلاف و مذمت نے لے لی۔ پھر یہ بھی ہوا کہ جن لوگوں نے اس دعوت پر لبیک کہا ان میں سے بھی کتنے ہی دور تک ساتھ نہ چل سکے اور مختلف اختلافوں اور شکایتوں کے نام پر اپنی پرانی ڈگر پر واپس چلے گئے۔ واپس جاتے وقت کہنے کو تو انھوں نے ـــــ قریب قریب سبھی نے ـــــ یہی کہا کہ ہمیں نصب العین سے کوئی اختلاف نہیں ہے، بلکہ فلاں شخص یا اشخاص کے کردار سے شکایت ہے، یا اس کے افکار اور پالیسیوں سے اختلاف ہے (گویا وہ تحریک سے خود مقاصد تحریک ہی کی خاطر علیحدہ ہوئے تھے اور یہ صرف اقامت دین کے حقیقی نصب العین کی پرخلوص محبت، سچی وفاداری اور بے لوث خدمت کا جذبۂ صادق تھا جس نے انھیں اس غیر معمولی اقدام پر مجبور کر دیا تھا مگر بعد میں ان کے طرز عمل اور مشاغل نے صاف بتا دیا کہ وہ خود اپنے تحت الشعور سے ناواقف تھے۔ انکی شکایتیں اور رائیں ممکن ہے کہ اپنی جگہ بالکل صحیح رہی ہوں، مگر ساتھ ہی یہ مانے بغیر بھی رہا نہیں جاسکتا کہ اب دراصل ان کا تحت الشعور اس نصب العین ہی کی یقینی ضرورت کے احساس سے اور اس کی سچی آرزو سے بے گانہ ہو چلا تھا، جو بعد میں چل کر شاید شعور کی بے گانگی کی حد تک بھی جا پہنچا۔ اگر صورت واقعہ یہ نہ ہوتی تو دنیا کو دکھائی دے گیا ہوتا کہ وہ تحریک کے 'ناکارہ' نظم سے الگ ہو چکنے پر اس کے اصل مقصد کے لیے پہلے سے کہیں زیادہ سرگرم ہو گئے ہیں، ان کی زبانوں سے یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً اور اَنْ اَقِیْمُوا الدِّیْنَ کی منادی اور زیادہ شدت اور بے چینی سے بلند ہونے لگی ہے اور ان کی اس پکار میں سوز و اخلاص کا جذبہ اور زیادہ گہرا ہو گیا ہے، ان کا ذہن اس نصب العین کی خاطر فکرمند رہنے کے لیے اور زیادہ یکسو ہو چکا ہے، ان کے پیام میں اور زیادہ کشش اور ان کے عمل میں اور زیادہ جاذبیت آ گئی ہے، باطل اور نظام باطل سے ان کی پنجہ آزمائی اور بیزاری اور زیادہ شدید ہو گئی ہے ـــــ مگر اتنی اونچی توقعات کے برآنے کا تو کیا سوال، حیرت سے دیکھا گیا کہ سرے سے نصب العین ہی کی طرف سے خاموشی اختیار کر لی گئی۔ اس انقلاب حال کو آخر اس کے سوا اور کیا کہا جاسکتا ہے کہ یہ لوگ تحریک کے ساتھ آنے سے پہلے جہاں تھے وہیں واپس چلے گئے اور قیاس کہتا ہے کہ انھیں وہاں واپس لے جانے والی چیز بالعموم وہی ذہنیت تھی جس کی یہاں گفتگو ہو رہی ہے اور جو افراد ملت کے رہے سہے ایمانی حوصلوں پر بھی اکاس بیل بن کر چھائی ہوئی ہے۔

بڑھنے والوں کی مخالفت کا خیال تک دل میں نہ لائیں گے۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں سے بے شمار لوگوں نے اس توقع کا بھی کوئی موقع نہیں دیا اور انھوں نے اپنی زبان حال سے گویا یہ اعلان کر دیا کہ ''ہم جس کے ساتھ نہیں وہ ہمارا دشمن ہے۔'' ان کے تحت الشعور میں غالباً یہ خیال سما گیا کہ ہم اس دعوت کی مخالفت نہیں کرتے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ ہمیں اپنی فرض ناشناسی کا اور اس تحریک کے برحق ہونے کا خود بھی اعتراف ہے اور اس طرح ہم آپ سے آپ مجرموں کے کٹہرے میں کھڑے دکھائی دینے لگیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ پوزیشن اختیار کر لینا کوئی آسان کام نہیں تھا۔ اس لیے وہ مجبور تھے کہ مخالفین تحریک کی صفوں میں جا شامل ہوں۔

(۲) وہ سبب، جو مخصوص طور پر غیر مسلم حضرات کی طرف سے تحریک کی مخالفت کا محرک بنا ہوا ہے، ان کا ملی تعصب ہے۔ یہ تعصب ذہن انسانی کی ایک زبردست اور عام وہمہ گیر بیماری ہے، جو ہر مذہب کے ماننے والوں میں دوسرے مذاہب کے خلاف اکثر و بیشتر ضرور ہی موجود ہوا کرتی ہے۔ ایسی سعید اور حق پرست روحیں بہت کم ہوتی ہیں جو اس تنگ نظری اور گروہ پرستی سے بلند ہوتی اور کسی چیز کے محض ذاتی جوہر کو دیکھ کر اسے ماننے یا نہ ماننے کا فیصلہ کیا کرتی ہیں۔ چنانچہ یہی تعصب ہے جو آج تحریک اسلامی کی راہ کا بھی ایک بھاری پتھر بنا ہوا ہے۔ غیر مسلم لوگ جب یہ سنتے ہیں کہ اس ملک میں اسلام کو قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، تو بالعموم ان کے ذہنوں میں یہ خیال گردش کرنے لگتا ہے کہ یہ تو ہمارے آدمیوں کو مسلمان بنانے یا یہاں مسلمانوں کی حکومت قائم کرنے کی ایک خطرناک اسکیم ہے، جس کے بعد وہ اس تحریک کی بھر پور مخالفت کرنا اپنا ملی فریضہ سمجھنے لگتے ہیں۔ ان کا ذہن اس جوہری فرق کو محسوس کر لینے کی پوزیشن میں ہوتا ہی نہیں، جو اسلامی حکومت اور مسلمان حکومت کے درمیان فی الواقع موجود ہے، نہ وہ یہ سمجھ پاتا ہے کہ ایک صحیح اسلامی تحریک و دعوت اور معروف قسم کی تبلیغ، دونوں دو چیزیں ہیں، نہ وہ اس بات پر غور کر پاتا ہے کہ اگر یہ تحریک مسلمانوں کی تعداد بڑھا کر مسلم اقتدار حاصل کرنے کی محض ایک تدبیر ہوتی تو خود مسلمان اسے خوش آمدید کہنے کے بجائے اس کے درپے کیوں ہوتے؟ اور اس کا ساتھ دینے والوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی کیوں ہوتی؟'' ان کی اس ذہنیت کی وجہ اگر ڈھونڈی جائے تو یقیناً وہی نکلے گی جسے ملی تعصب کہا جاتا ہے۔ یہ لوگ اس تحریک کو دراصل اس نگاہ سے دیکھتے ہیں کہ یہ ایک ایسے دین کو قائم کرنے کے لیے اٹھی ہے، جو

ہمارے لیے 'غیر' اور ہمارے دھرم سے بنیادی طور پر مختلف ہے اور جس کا فروغ ہمارے دھرم، ہماری تہذیب، ہماری قوم اور ہماری ملت، سب کے لیے زوال کے ہم معنی ہے۔

اگر چہ یہ ملی تعصب خود ہی اتنی طاقت رکھتا ہے کہ لوگوں کو اقامت اسلام کی دعوت کی مخالفت پر بری طرح ابھار دے، لیکن سوء اتفاق سے اسے یہاں ایک زبردست معاون طاقت بھی حاصل ہے، جس نے اس کی قوت واثر کو دوآتشہ بنا رکھا ہے۔ یہ معاون طاقت، وہ قومی کش مکش اور فرقہ وارانہ کشیدگی ہے، جو ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ابھی ماضی قریب میں پورے جوش و خروش کے ساتھ بپا رہی ہے اور جس کی تلخیاں آسانی کے ساتھ بھلائی نہیں جاسکتیں۔ اس کش مکش نے غیر مسلموں کو صرف مسلمانوں ہی کا نہیں، بلکہ خود اسلام کا بھی حریف بنا کر رکھ دیا ہے۔ قدرتی طور پر تحریک اسلامی بھی اس نامبارک صورت حال کے فطری تقاضوں سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ چنانچہ کتنے ہی غیر مسلم اسے مسلمانوں کی قومی امنگ ہی کا ایک نیا قالب سمجھتے ہیں اور ان کی نظر میں اس کی حیثیت ایک اصولی اور نظریاتی تحریک کے بجائے ایک ایسی قوم کی قومی تحریک کی ہے جو ان سے معاندانہ پنجہ آزمائی کرتی رہی ہے اور انہیں گہرے زخم پہنچاتی رہی ہے۔ ایسی حالت میں اس دعوت کو وہ اپنی قوم کے لیے بھی اور اپنے دھرم کے لیے بھی ایک نیا چیلنج ہی سمجھ سکتے ہیں، جس کے بعد اس کے بارے میں مخالفت کے سوا اور کچھ سوچ ہی نہیں سکتے۔

(۳) تیسرا سبب جو مخصوص طور پر ارباب حکومت سے تعلق رکھتا ہے، بڑی حد تک یہ مشہور حقیقت ہے کہ ''حکومت کے صرف کان ہوتے ہیں آنکھیں نہیں ہوتیں۔'' تحریک اسلامی کا سارا قول و فعل اگر چہ ایک کھلی کتاب کی حیثیت رکھتا ہے، لیکن بڑے افسوس کی بات ہے کہ ایک طویل مدت گزر چکنے کے باوجود اس کے بارے میں حکومت کی معلومات ابھی تک انتہائی ناقص اور غلط ہیں اور اس نے اس سلسلہ میں احساس ذمہ داری کا اب تک جو مظاہرہ کیا ہے اس کی ستائش بالکل ہی نہیں کی جاسکتی۔ اس کی معلومات کا انحصار بالعموم ایسے رپورٹروں کی فراہم کی ہوئی اطلاعات ہی پر رہا ہے جو بیچارے تحریک کے دستور کو، اس کے اصولوں کو، اس کی اصطلاحوں کو حتی کہ اس کے لٹریچر کو بھی اچھی طرح سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے دوسری طرف ان کا ذہن بھی حالات کی بنا پر اس دعوت کے خلاف تعصب اور بدگمانیوں کا کچھ نہ کچھ بہر حال شکار رہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسے رپورٹروں کی فراہم کی ہوئی اطلاعات کو بنیاد بنا کر تحریک اسلامی کے بارے میں جو

رائے قائم کی جائے گی، اس کے منصفانہ ہونے کی کوئی توقع کی ہی نہیں جاسکتی۔ چنانچہ حکومت نے اس کے بارے میں وقتاً فوقتاً جو بیانات دیے ہیں اور اس کے رہنماؤں اور کارکنوں کے ساتھ وہ جو رویہ اختیار کرتی رہی ہے، اس سے نہ تو حقیقت شناسی کا کوئی ثبوت ملتا ہے اور نہ راستی اور انصاف پسندی کی اس میں کوئی نمود پائی جاتی ہے۔ اس نے جو الزامات اس کے خلاف عائد کیے ہیں، وہ اتنے عجیب وغریب ہیں کہ جو شخص بھی اس کے نصب العین، اس کے طریق کار، اس کے دستور، اس کے اصول، اس کے مزاج اور اس کی تاریخ سے واقف ہوگا وہ انھیں ستم ظریفی ہی قرار دے گا۔ حتیٰ کہ خود یہ حکومت بھی اپنے تمام تر ذرائع معلومات کے باوجود اس تحریک کی اٹھائیس سالہ تاریخ کے کسی صفحے پر بھی انگلی رکھ کر نہیں بتاسکتی کہ یہاں سیاہ دھبہ موجود ہے۔ اس کے باوجود اگر وہ الزام عائد کرنے سے باز نہیں رہ سکتی تو اسے اس کی انتہائی افسوسناک ناواقفیت ہی کا، یا پھر انتہائی بے بنیاد بدگمانی ہی کا نتیجہ کہا جاسکتا ہے اور اگر خدانخواستہ بات یہ نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ پھر جانتے بوجھتے بہتان تراشی کی جارہی ہے۔ خدا نہ کرے کہ یہ بات کسی درجے میں بھی صحیح ہو۔

مخالفتوں سے عہدہ برآ ہونے کی ضرورت

جب تحریک اسلامی پر اس طرح مخالفتوں کی یورش ہورہی ہو اور اس کا سلسلہ کبھی ختم ہونے والا بھی نہ ہو، تو ضروری تھا کہ وہ بھی ان کے بارے میں سوچے سمجھے رویے اختیار کرے اور ان سے مناسب انداز میں عہدہ برآ ہونے کی کوشش کرے۔ کیونکہ یہ مخالفتیں اس کی راہ کے بھاری پتھر ہیں۔ جن کو ہٹائے بغیر یا جن پر کاری ضرب لگائے بغیر اس کے قدم آگے بڑھ ہی نہیں سکتے۔ اس لیے اس نے بجا طور پر اس ضرورت کو پوری اہمیت سے محسوس کیا ہے اور مخالفتوں کے اس پھیلے ہوئے محاذ کو سر کرنے کے لیے واضح اور متعین طریقے اختیار کیے ہیں۔

قرآن کی اصولی ہدایتیں

یہ طریقے اس نے چونکہ قدرتی طور پر وہیں سے اخذ کیے ہیں، جہاں سے اقامت دین کا نصب العین اور اس نصب العین کے حصول کا طریق کار اخذ کیا تھا، اس لیے انھیں سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن حکیم کی ان ہدایتوں کو سامنے رکھ لیا جائے جن پر یہ طریقے مبنی ہیں۔ یہ ہدایتیں ترتیب وار حسب ذیل ہیں:

وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ
(انعام: ۱۰۵)

(اور ہم اسی طرح دلیلوں کو مختلف پہلوؤں سے بیان کرتے ہیں (تاکہ لوگ بات کو اچھی طرح سمجھ جائیں) اور تاکہ وہ پکار اٹھیں کہ تم نے پڑھنے (اور سنانے) کا حق ادا کر دیا اور تاکہ ہم اس (پیغام) کو جان لینے کا ارادہ رکھنے والوں کے لیے بالکل واضح کر دیں۔)

وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ الخ .... (نحل: ۱۲۵)

(اوران سے بحث ومباحثہ کروایسے طریقے سے جو'احسن'(سب سے اچھا) ہو۔)

وَلَا تَسْتَوِي الْحَسَنَةُ وَلَا السَّيِّئَةُ اِدْفَعْ بِالَّتِيْ هِيَ اَحْسَنُ. الخ...
(حم سجدہ : ۳۴)

(بھلائی اور بُرائی برابر نہیں ہوا کرتیں، (برائی کو) ایسے طریقے سے دفع کرو جو سب سے بہتر ہو..........الخ)

خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَ اَعْرِضْ عَنِ الْجَاهِلِيْنَ (اعراف : ۱۹۹)

(درگزر سے کام لو، اور نیکی کا حکم دو، اور جاہلوں سے کنارہ کشی اختیار کرو۔)

ان آیتوں کا منشا یہ ہے کہ دین حق[1] کے داعی کو اپنی دعوت لوگوں تک پہنچا دینے کے لیے شرح وتفصیل اور افہام وتفہیم کی ہر وہ کوشش انجام دے دینی چاہیے جس کی ضرورت ہو اور جس کے بعد اس کے پیغام کا کوئی گوشہ بھی دھندلکے میں نہ رہ جائے، یہاں تک کہ مخاطب بھی یہ تسلیم کرلے کہ بات واضح ہو چکی۔ اس کے[2] بعد بھی جو لوگ قبول حق کے لیے آمادہ نہ ہوں اور اس کے خلاف اظہار رائے کرتے رہیں، ان کے ذہنوں میں اپنی بات اتارنے کے لیے دلائل اور بحث ومباحثہ کے ذریعہ مزید کوشش کی جانی چاہیے۔ لیکن اس بحث ومباحثہ کا انداز لازماً ایسا ہونا چاہیے جو استدلال اور لب ولہجہ، ہر لحاظ سے احسن اور موزوں ترین ہو اور جو مخاطب کا دل ودماغ جیت لینے کی زیادہ سے زیادہ صلاحیت رکھتا ہو۔ لیکن[3] اس سارے اہتمام کے باوجود بھی اگر کوئی مخالفت سے باز نہ آئے، حتیٰ کہ بدکلامیوں اور ایذا رسانیوں پر بھی اتر آئے تو اس کے جواب میں

صبر وتحمل ہی کا نہیں، بلکہ خوش گفتاری اور حسن سلوک کا بھی رویہ اپنانا چاہیے، برائی (سیئہ) کی آگ پر بھلائی (حسنہ) کا سرداب ڈالتے رہنا چاہیے۔ حق کا یہ وار اتنا کارگر ہوگا کہ عداوت کی حد تک بڑھی ہوئی مخالفتیں بھی بسا اوقات سپر ڈال دینے پر مجبور ہو رہیں گی۔ ہاں، اب بھی ایسے لوگ ضرور ہوں گے جو دل کے پتھر ثابت ہوں گے اور انسانیت، سنجیدگی اور معقولیت کو یکسر بالائے طاق رکھ کر دعوت کی اندھی عداوت ہی کو اپنا اوڑھنا بچھونا بنائے رکھنے پر مصر رہیں گے۔ داعی کو چاہیے کہ ایسے جاہلیت کے مارے ہوؤں کو ان کے اپنے حال پر چھوڑ دے اور انھیں خدا کے حوالے کر کے آگے بڑھ جائے۔

ہر شخص تسلیم کرے گا کہ قرآن حکیم نے دعوت حق کی مخالفتوں کے جواب میں اختیار کرنے کے لیے جو یہ اصولی طریقے تلقین فرمائے ہیں وہ اتنے معقول، اتنے صحیح، اتنے مؤثر اور اتنے کامیاب ہیں جن سے زیادہ معقول اور مؤثر طریقوں کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

مخالفتوں کے جواب میں تحریک کا رویہ

ان ہدایات خداوندی کو سامنے رکھ کر تحریک اسلامی نے اوپر بیان کی ہوئی مختلف اقسام کی مخالفتوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جو طریقے اختیار کر رکھے ہیں، ان کی مختصر وضاحت ترتیب وار یہ ہے:

(الف) عام وہمہ گیر اسباب کے تحت وجود میں آنے والی مخالفتوں میں سے:

● ناواقفیت[1] اور غلط فہمی کی بنا پر کی جانے والی مخالفت کے جواب میں تحریک اپنی دعوت کی توضیح اور تفہیم کے لیے ہر وہ کوشش انجام دینے کا اہتمام کرتی ہے جو مخاطب کو اپنی بات اچھی طرح سمجھا دینے کے لیے ضروری ہو۔ جیسا کہ قرآن حکیم کی مذکورہ بالا ہدایتوں میں سے پہلی ہدایت کا منشا تھا اور عقل عام کا بھی تقاضا تھا۔ ظاہر بات ہے، اگر کسی شخص کے سامنے دعوت اپنی صحیح شکل میں آ ہی نہیں سکی ہے اور ایسی حالت میں وہ اس کی مخالفت کر رہا ہے، تو اس مخالفت کو موافقت سے بدل دینے کی بنیادی تدبیر اس کے سوا اور کچھ ہو ہی نہیں سکتی کہ اس کی ناواقفیت کو واقفیت سے بدل دیا جائے۔ اس لیے جس کسی کے بارے میں یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ دعوت کے اصل پیغام اور اصول و مقاصد کی طرف سے اندھیرے میں ہے، اس کو صحیح بات بتانے اور

سمجھا دینے کی پوری کوشش کی جاتی ہے۔

● بدگمانی[۲] کی وجہ سے کی جانے والی مخالفت کا اصل اور موثر جواب چونکہ صرف تحریک کا طریق کار اور اس کے علم برداروں کا عملی رویہ ہی دے سکتا ہے، یا پھر کسی درجہ میں اس کے اصول و مقاصد کی مدلل وضاحت بھی اس سلسلے میں کچھ کام دے سکتی ہے، اس لیے تحریک اس بارے میں انھی تینوں چیزوں پر اعتماد کرتی ہے۔ یہ برابر اس امر کی فکر میں رہتی ہے کہ اس کے طریق کار میں کوئی جھول نہ آنے پائے، تاکہ دنیا کو خواہ مخواہ کی قیاس آرائیوں کی کوئی گنجائش نہ مل سکے اور ہر انصاف پسند آدمی یہ محسوس کر لینے پر مجبور ہو جائے کہ یہ طریق کار کسی موقع پرست اور فریب کار گروہ کا ہرگز نہیں ہوسکتا۔ اسی طرح یہ اس بات پر بھی ہمیشہ نگاہ رکھتی ہے کہ اس کے کارکنوں کا عملی رویہ، ان کی اخلاقی روش اور ان کی عام سرگرمیاں راستی اور پاکیزگی کی اس صراط مستقیم سے ہرگز نہ ہٹنے پائیں جو انھیں ان کے مقدس نصب العین تک پہنچانے والی واحد راہ ہے۔ تاکہ دیکھنے والے یقین کر لیں کہ یہ چہرے فریب کاروں، مفاد پرستوں اور دین فروشوں کے چہرے نہیں ہو سکتے۔ حتی کہ غیروں کا دل بھی پکار اٹھے کہ یہ ایسے لوگ ہیں جن کی بات غلط ہوسکتی ہے مگر ان کے قول اور فعل میں دوئی نہیں پائی جاسکتی، ان کا ذہن صحیح غور و فکر میں ناکام ثابت ہوسکتا ہے مگر ان کا ضمیر اخلاص و صداقت سے بے بہرہ نہیں کہا جاسکتا۔ لیکن اپنی ان ساری کوششوں کے باوجود تحریک کو یہ خوش گمانی بالکل نہیں ہے کہ بدگمانیوں کے طوفان کا زور توڑنا کوئی آسان کام ہے، اس لیے یہ بڑے صبر سے کام لے رہی ہے اور توقع رکھتی ہے کہ صداقت کو بدگمانیوں اور تہمت تراشیوں کے اٹھائے ہوئے دھوئیں میں ہمیشہ کے لیے چھپایا نہ جاسکے گا۔ بلکہ ایک وقت آئے گا جب غبار چھٹے گا اور حقیقت اپنے آپ کو تسلیم کرالے گی۔ چنانچہ خدا کا شکر ہے کہ ایک قابل لحاظ حد تک یہ توقع اس مدت میں بھی پوری ہوچکی ہے۔ جو لوگ پہلے اسے تخریبی اور مفسدانہ کارروائیوں کا مسلسل الزام دیا کرتے تھے وہ اب اس الزام کو زبان پر لانے کی جسارت بہت کم کرتے ہیں۔ البتہ اس کے بجائے کچھ نئے اعتراضات عائد کر کے مخالفت کا فرض بھی ادا کیے جا رہے ہیں۔ مثلاً یہ کہ اس تحریک کے نظریات قوم دشمن ہیں۔ وغیرہ ذالک۔

● مذہب[۳] کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں اس دور کی مایوسی اور بے اعتمادی کی پیدا کی ہوئی مخالفت کے جواب میں یہ دعوت اظہار حقیقت اور استدلال کا رویہ اختیار کیے

ہوئے ہے۔ یعنی وہ مضبوط دلائل سے اس حقیقت کو نمایاں کرتی رہتی ہے کہ اسلام ایک نظام فکرو عمل اور ایک ایسا مکمل نظام حیات ہے جس کے اندر انسانی مسائل کا سب سے بہتر اور کامیاب حل موجود ہے اور جو انسان کو آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ دنیا کی بھی جملہ کامرانیوں اور خوش بختیوں سے ہمکنار کرتا ہے۔ چنانچہ وہ ایک طویل مدت تک اپنی ان بے نظیر صلاحیتوں کا عملی مظاہرہ کر بھی چکا ہے اور آیندہ بھی جب اسے موقع ملے گا ایسا ہی کرے گا۔ اس وقت اگر وہ انسانی زندگی کے تمدنی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی میدانوں میں دکھائی نہیں دے رہا ہے تو اس کی وجہ یہ بالکل نہیں ہے کہ وہ وقت کا ساتھ نہیں دے سکتا، بلکہ یہ ہے کہ یہ وقت اس کا ساتھ دینے کی صلاحیت نہیں رکھتا، ورنہ جب بھی انسان کے دل و دماغ میں پھر کبھی اتنی پاکیزگی، اتنی وسعت اور اتنی بلندی آجائے گی کہ وہ اسلامی نظام کے اصولوں کی آفاقیت، مقاصد کی عظمت، اقدار کے حسن اور افکار کی صالحیت اور ارتقائی جوہریت سے اپنے آپ کو ہم آہنگ کرسکے، تو یہ نظام اس کے مسائل کو اس طرح کامیابی سے حل کردے گا کہ اس کا اس وقت وہ تصور بھی نہیں کرسکتا۔ اس دعوے کے ثبوت اور اس حقیقت کے اظہار کے لیے تحریک شروع ہی سے ایسے لٹریچر کی تیاری میں لگی ہوئی ہے جو علمی طور پر یہ واضح کردے کہ انسانی زندگی کے اہم مسائل کے بارے میں اسلام کیا اصول پیش کرتا ہے اور ان اصولوں کی بنیاد پر یہ مسائل کس طرح خوش اسلوبی سے حل کیے جاسکتے ہیں۔

● دین[۴] اور سیاست کی تفریق کے چھائے ہوئے نظریے کی بنا پر تحریک کی جو مخالفت کی جارہی ہے، اس کا جواب یہ اس نظریے کی مدلل تردید سے دے رہی ہے۔ چنانچہ اس حقیقت کو اس نے پوری طرح کھول دیا ہے کہ دوسرے مذاہب کا معاملہ چاہے جو کچھ بھی ہو، مگر اسلام میں دین سے سیاست کی علیحدگی کا کوئی تصور نہیں اور ایک نہیں متعدد دینی حقائق اس نظریے کو کھلی ہوئی بے دینی اور گمراہی قرار دیتے ہیں: مثلاً، اللہ، دین اور خدا پرستی کے جو تصورات قرآن حکیم نے دیے ہیں وہ اس چیز کو بھی جسے 'سیاست' کہتے ہیں، دین کا جزو لازم ٹھہراتے ہیں۔ اسی طرح قرآن وسنت کے احکام میں سیاسی احکام بھی اسی اہمیت اور اسی تاکید کے ساتھ موجود ہیں جس طرح نماز، زکوٰۃ، روزے اور حج وغیرہ کے احکام موجود ہیں اور ان کی پیروی کو بھی اسی طرح ضروری اور تقاضاے دینداری قرار دیا گیا ہے جس طرح کہ دوسرے احکام کی پیروی کو قرار دیا گیا

ہے۔ پھر ان دوسرے احکام میں سے بھی بیشتر کا حال یہ ہے کہ ان کی صحیح بجا آوری انھیں احکام سیاسی کی تعمیل اور ان کے نفاذ ہی پر موقوف ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ اسلام بھی ایک ایسا دین ہے جس کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں، گویا روز روشن میں سورج کے وجود سے انکار کرنا ہے۔

اس نظریے کی تردید میں ان دینی نصوص اور واقعاتی شہادتوں کے علاوہ تحریک عقلی دلائل سے بھی کام لے رہی ہے۔ یعنی وہ لوگوں کو یہ حقیقت سمجھا رہی ہے کہ خدائے کائنات کی طرف سے آیا ہوا کوئی دین ایسا ہو ہی نہیں سکتا جو انسانی زندگی کے اہم ترین اجتماعی مسائل کے بارے میں کوئی رہنمائی نہ دیتا ہو، نہ خدا کے تصور سے یہ بات میل کھا سکتی ہے کہ اس نے انسان کے مادّی وجود کے لیے تو اتنے وسائل مہیا فرما دیے ہوں، مگر اس کی اخلاقی اور روحانی ضرورتوں کی طرف سے بے اعتنائی اختیار کر لی ہو اور اگر ان ضرورتوں کے بارے میں اپنی ہدایتیں عطا فرمائی بھی ہوں تو وہ صرف اس کے انفرادی مسائل ہی تک محدود ہوں، عظیم تر اجتماعی معاملات پھر بھی نظر انداز ہی کر دیے گئے ہوں!

● نفسانیت[۵] جس مخالفت کا سرچشمہ ہو، اس کے جواب میں، بدیہی طور پر، معقولیت کا ایک ہی راستہ اختیار کیا جا سکتا ہے اور وہ یہ کہ اسے صبر و تحمل اور باوقار خاموشی سے نظر انداز کر دیا جائے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کے بارے میں، جو امر حق کو اپنی خواہش نفس پر قربان کر دینے پر مصر ہوں اور جانتے بوجھتے اس کی مخالفت اور عداوت کو اپنا شعار بنا لیں، اس کے سوا اور کوئی چارۂ کار رہ ہی نہیں جاتا کہ انھیں ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے، اور ان کی طرف، اگر کوئی توجہ کی جائے تو صرف اس حد تک کہ ان کے حق میں نفسانیت کے روگ سے شفا پا جانے کی دعا کی جائے۔ چنانچہ ایسے لوگوں کی مخالفت کے جواب میں تحریک اسلامی یہی مسلک اپنائے ہوئے ہے۔"

● اُس مخالفت[۶] سے عہدہ برآ ہونے کے لیے، جس کی وجہ یہ خیال ہو کہ فی نفسہٖ یہ دعوت ہی غلط اور خلاف حق ہے، تحریک مسلسل اس کوشش میں لگی ہوئی ہے کہ اپنی حقانیت اور ضرورت کو دلائل سے اچھی طرح واضح کر دے۔ اس غرض سے وہ اس ضمن کی تینوں بنیادی حقیقتوں کو روشنی میں لاتی رہتی ہے۔ ایک تو یہ کہ انسان کی صحیح رہنمائی، اس کی کامیاب زندگی اور اس کی سچی فلاح کے لیے اللہ تعالیٰ کی ہدایت بالکل ضروری ہے۔ دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی یہ

ہدایت اس وقت صرف قرآن کے صفحات میں اور صرف اسلام کی شکل میں پائی جاسکتی ہے۔ تیسری یہ کہ اس ہدایت کی یعنی اس قرآن اور اس اسلام کے احکام کی مکمل اطاعت کے بغیر نہ اس کی پیروی کا فرض ادا ہوسکتا ہے اور نہ اس کے فوائد وثمرات حاصل ہو سکتے ہیں۔ اقامت دین کی دعوت دراصل اسی مکمل اطاعت کی دعوت کا دوسرا نام ہے۔

(ب) مخصوص اور محدود نوعیت کے اسباب کے تحت وجود میں آنے والی مخالفتوں میں سے:

- پہلی قسم کی مخالفت کا توڑ کرنے کے لیے جس کا تعلق مخصوص طور پر مسلمانوں کے گروہ سے ہے اور جو ان کے ناقص تصور دین کی، ان کی بے جان مذہبیت کی اور ان کی شکست خوردہ ذہنیت کی پیداوار ہے، تحریک اسلامی کی کوشش قدرتی طور پر یہ ہے کہ ان کے اندر خود شناسی کا جوہر پیدا کیا جائے اور ان کے ذہنوں کو دین اور دینداری کے اس بے جان تصور کی گرفت سے آزاد کرایا جائے جو غیر اسلامی ماحول اور نظام کے تحت مدت سے زندگی بسر کرنے کے نتیجہ میں ان کے اندر گھر کر چکا ہے۔ اس مقصد سے وہ ایک طرف تو دین کا وہ جامع، حیات آفریں اور انقلابی تصور پوری تفصیل اور استدلال کے ساتھ ان کے سامنے لاتی رہتی ہے جو اسلام اور قرآن کا واقعی تصور ہے، دوسری طرف ان کے اندر سوئی ہوئی اس ایمانی حس کو بیدار کر دینے کی جدوجہد میں لگی ہوئی ہے جو مومن کو کسی بھی غیر اسلامی نظام اور خدا فراموش اقتدار حکومت کے انگیز کرنے پر کبھی آمادہ ہی نہیں رہنے دے سکتی اور جو اسے حق کی شہادت اور دین کی اقامت کے اس فریضے کے لیے یکسو کر دیا کرتی ہے جسے انجام دینے ہی کے لیے امت مسلمہ کا قیام عمل میں لایا گیا ہے۔
- دوسری قسم کی مخالفت سے، جو مخصوص طور پر غیر مسلموں کی طرف سے ہو رہی ہے اور جس کا اصل محرک ان کا ملی تعصب ہے، عہدہ برآ ہونے کے لیے تحریک مختلف پہلوؤں سے جدوجہد کر رہی ہے۔

سب سے اہم اور بنیادی کوشش تو اس کی یہ ہے کہ ان کے اندر خالص حق پسندی کا جذبہ اور آخرت کی فکر پیدا کی جائے، تاکہ وہ کسی بات کو محض اس کے اپنے ذاتی جوہر کے پیش نظر قبول یا رد کرنے کا رویہ اپنا سکیں۔

دوسری کوشش یہ کر رہی ہے کہ اسلام کی اصل حقیقت اور اصل حیثیت ان پر اچھی طرح

واضح کردی جائے۔ پوری تفصیل اور مؤثر دلائل کے ساتھ انھیں یہ بات ذہن نشین کرادی جائے کہ اسلام نہ مسلمانوں کا کوئی قومی مذہب ہے اور نہ وہ کسی دوسرے آسمانی مذہب کا حریف ہے، بلکہ سارے انسانوں کے لیے ان کے معبود برحق کا بھیجا ہوا دین اور اسی سلسلۂ ہدایت کی آخری کڑی ہے جس سے اللہ تعالیٰ کی رحمت، نوعِ انسانی کو ابتداء ہی سے نوازتی رہی ہے اور جس کے بنیادی اصول واحکام ہمیشہ ایک ہی سے رہے ہیں۔ اس وقت سابق آسمانی کتابوں کی حقیقی پیروی اور اس پیروی کا حقیقی مقصد بھی اسی قرآن اور اسلام کی پیروی پر موقوف ہے۔ اسلام کی حیثیت ہوا، پانی اور روشنی کی طرح بالکل عام ہمہ گیر اور آفاقی ہے۔ جس طرح ان چیزوں پر انسان کا مادی وجود موقوف ہے اور انھیں خدا نے پوری نوع انسانی کے لیے مہیا فرما رکھا ہے، اسی طرح، اسلام، پر انسان کے اخلاقی اور روحانی وجود کی حقیقی زندگی موقوف ہے اور اسے اللہ رب العٰلمین نے سارے انسانوں کے لیے اور ہمیشہ کے لیے نازل فرما رکھا ہے۔ اس لیے یہ جس طرح مسلمانوں کی چیز ہے اسی طرح غیر مسلموں کی بھی ہے۔

تیسری کوشش اس کی یہ ہے کہ 'اسلامی حکومت' اور 'مسلم حکومت' کو ایک سمجھ لینے کی غلط فہمی کا پوری قوت سے ازالہ کردیا جائے۔ عقلی، شرعی اور تاریخی ہر طرح کے دلائل سے یہ حقیقت کھول دی جائے کہ اسلامی حکومت کچھ اور ہی شے ہے اور مسلم حکومت بالکل دوسری چیز ہے۔ ان دونوں میں جوہری اور بنیادی فرق ہے۔ یہ اپنے اصول، اپنے مقاصد، اپنی اقدار، اپنے اعمال اور اپنے ثمرات، ہر چیز میں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔ اگرچہ اسلامی حکومت کے چلانے والے بھی 'مسلمان' ہوتے ہیں اور مسلم حکومت کے چلانے والے بھی، لیکن ایک ہی فضا میں پرواز کرنے کے باوجود اُن کا جہاں اور ہوتا ہے اور اِن کا جہاں اور۔ اسلامی حکومت اگر اخلاقی حدود کی پابند، اللہ رب العالمین کے احکام کی مکمل پیرو اور اس زمین پر خدا کی مرضی پوری کرنے والی ہوتی ہے، تو مسلم حکومت، مسلمان قوم کی امنگوں کی خادم ہوا کرتی ہے۔ اسلامی حکومت کا مقصد وجود اگر حق اور انصاف کا قیام، نیکی اور معروف کا فروغ اور ناانصافی، حق تلفی، بدی اور منکر کی بیخ کنی ہوا کرتا ہے تو مسلم حکومت کی نظر ہر وقت مسلمانوں کے قومی مفاد پر جمی رہا کرتی ہے۔ کوئی دوسری بات اس کے سامنے صرف اس وقت آتی ہے جب یہ قومی مفاد اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس لیے مسلم حکومت غیر مسلموں کے لیے تو کیا خود ایک سچے مسلمان کے لیے بھی قابل قبول نہیں

ہو سکتی، جب کہ اسلامی حکومت اور اسلامی نظام وہ نعمت باردہ ہے جسے ہر خیر پسند اور سلیم الفطرت انسان کی آنکھوں کی ٹھنڈک ہونا چاہیے۔

چوتھی کوشش اس ضمن میں تحریک اسلامی کی یہ ہے کہ اس قومی کش مکش کے باقی ماندہ اثرات کا پوری طرح خاتمہ کر دیا جائے جو تقسیم ہند سے پہلے کی سیاست کا ایک نامبارک عطیہ رہی ہے۔ اس غرض سے یہ مسلمانوں کو خصوصیت سے اس بات کی برابر تلقین کرتی رہتی ہے کہ وہ ان تمام طور طریقوں سے دور اور ان ساری کشاکشوں، بحثوں اور مطالبوں سے بلند ہیں، جن سے یہ کش مکش پیدا ہوتی اور پروان چڑھتی ہے اور ایک قوم کے مقام سے اونچے اٹھ کر ایک اصولی پارٹی کے شایان شان طرز عمل اختیار کرلیں اور اللہ کے دین کی دعوت، شہادت اور اقامت کے نصب العین کے لیے یکسو ہو کر اپنی ساری دلچسپیاں اور سرگرمیاں اسی پر مرکوز کر دیں۔ ان کی جو بھی لڑائی ہو، صرف غلط اصول اور باطل عقائد سے ہو، کفر اور جاہلیت سے ہو، شرک اور فسق سے ہو، خدا فراموشی اور دین بیزاری سے ہو، غیر حق اور غیر اسلام سے ہو، اسی طرح ان کی جو بھی جدوجہد ہو، صرف صحیح اصول اور صحیح عقائد کے لیے ہو، دین و ایمان کے لیے ہو، حسن اخلاق اور حسن عمل کے لیے ہو، خدا پرستی اور خیر و تقویٰ کے لیے ہو، حق اور اسلام کے لیے ہو، تاکہ ان کی قومی نوعیت کی کوئی روش دعوت اسلامی کی راہ کا روڑا نہ بن سکے۔

● تیسری قسم کی مخالفت، جو مخصوص طور پر ارباب حکومت کی طرف سے پیش آ رہی ہے، اپنے اندر کچھ خصوصی اہمتیں رکھتی ہے اور اس کے بارے میں تحریک کا طرز عمل بنیادی طور پر یہ ہے کہ معاشرے کے ان سب سے زیادہ ذمہ دار افراد پر اپنی دعوت کا گوشہ گوشہ آئینہ کی طرح واضح کر دے۔ یہاں تک کہ وہ خود اپنی آنکھوں سے بھی اسے پوری طرح دیکھ لیں، اس کے اصول و مقاصد سے براہ راست واقف ہو جائیں، انھیں اچھی طرح معلوم ہو جائے کہ یہ تحریک فی الواقع کیا چاہتی ہے؟ کیوں چاہتی ہے؟ اور کس طرح چاہتی ہے؟ اس غرض کے لیے یہ ہر وہ کوشش اور تدبیر اختیار کرتی رہتی ہے جو اختیار کی جا سکتی ہے۔ یہ ان کے پاس اپنا دستور، اپنا پروگرام، اپنا وہ لٹریچر جو اس کے اصول و مقاصد کی وضاحت کرنے والا ہوتا ہے، بھیجتی رہتی ہے اور جب کبھی مناسب موقع ملتا ہے، اس کے ذمہ دار افراد ارباب حکومت سے مل کر بالمشافہ

گفتگوؤں کے ذریعہ بھی اپنی دعوت کے بارے میں ان کی غلط فہمیوں یا ناواقفیتوں کو دور کرنے کا اہتمام کرتے رہتے ہیں۔ اگر چہ ان ساری کوششوں کا نتیجہ ابھی تک کچھ زیادہ کامیاب نہیں رہا ہے اور اس بارے میں ذمہ داری اور فرض شناسی کا رویہ اپنانے کی توفیق ان لوگوں کو بہت کم مل سکی ہے، تاہم ایسا بھی نہیں ہے کہ یہ کوششیں بالکل ہی رائیگاں ثابت ہوئی ہوں۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو بھی تحریک کی اپنی یہ کوششیں نہ رکتیں۔ کیونکہ وہ اس اصول کی قائل ہے کہ اسے اپنا فرض بہر حال ادا کرنا چاہیے، چاہے دوسرے اپنی ذمہ داری کا حق ادا کریں یا نہ کریں۔ اس لیے وہ ارباب حکومت کے طرز عمل کی پروا کیے بغیر انھیں اپنی دعوت سے پوری طرح واقف کرانے اور اپنی بات کو سمجھا دینے کی برابر کوشش کرتی رہی ہے اور آیندہ بھی کرتی رہے گی۔ خصوصاً اس لیے کہ دعوتی نقطۂ نگاہ سے ان لوگوں کی اہمیت دوسروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ ہے۔ کیونکہ ان کی حکومتی حیثیت کے علاوہ اپنی ایک شخصی حیثیت بھی ہے اور اپنی اس حیثیت میں بھی وہ اس کے اسی طرح مخاطب اور مطلوب ہیں جس طرح کہ دوسرا کوئی شخص ہوسکتا ہے۔ پھر وہ چونکہ سوسائٹی کے سربراہ یعنی قرآن کے لفظوں میں ''ملأ قوم'' بھی ہیں، اس لیے اصولی طور پر وہ تحریک کے مخاطب اول بھی ہیں۔ گویا انھیں اپنی دعوت پہنچانا اور ان پر اس کے سارے پہلوؤں کو اچھی طرح کھول دینا بیک وقت تین تین وجوہ سے ضروری ہے۔ اس وجہ سے بھی کہ وہ ملک کے صاحب امر ہیں، اس لیے تحریک اسلامی کے بارے میں انھیں کسی بے خبری یا غلط فہمی میں مبتلا نہ رہنے دینا چاہیے۔ اس وجہ سے بھی کہ معاشرہ کے افراد ہونے کے باعث دوسروں کی طرح ان کو بھی دعوت لازماً پہنچنی چاہیے اور اس وجہ سے بھی کہ ملک کے سربراہ (ملأِ قوم) ہونے کے باعث وہ اصولی طور پر تحریک کے اہم ترین مخاطب ہیں۔

اس سلسلہ میں ایک بات ضرور واضح رہنی چاہیے۔ تحریک اسلامی کو اس طرح کی کوئی خوش فہمی ہرگز نہیں ہے کہ حکومت صرف غلط اطلاعات اور غلط فہمیوں ہی کی بناء پر تحریک کی مخالفت کر رہی ہے اور اگر ان غلط فہمیوں کا ازالہ کر دیا جائے تو پھر یہ مخالفت بھی باقی نہ رہ جائے گی۔ اس کے بخلاف یہ اس حقیقت کو اچھی طرح جانتی ہے کہ دوسرے لوگوں کی طرح حکومت کی بھی مخالفت کے اسباب و محرکات کچھ اور ہو سکتے ہیں اور وہ صحیح معلومات رکھتے ہوئے بھی اس کی مخالفت کے

درپے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ جہاں کہیں اسے محسوس ہوتا ہے کہ اس جگہ مخالفت کا سبب غلط فہمی یا ناواقفیت نہیں بلکہ کوئی اور ہی چیز ہے وہاں اس کے جواب میں بھی یہ اسی کے مناسب رویہ اختیار کرتی ہے اور پھر ان ساری کوششوں کے باوجود بھی غالب امکان اسی بات کا سمجھتی ہے کہ حکومت کی مخالفت کسی حال میں بھی موقوف نہ ہوگی۔ کیونکہ جب یہ تحریک بذات خود ایک خاص اجتماعی نظام کے قیام کی خواہاں اور اس کے لیے کوشاں ہے تو موجودہ نظام اجتماعی کی گاڑی کھینچنے والی حکومت اسے فطری طور پر اپنا حریف ہی سمجھ سکتی ہے اور ظاہر ہے کہ حریف ٹھنڈے پیٹوں برداشت کرنے کی چیز نہیں ہوا کرتا۔

اہم ملّی و ملکی مسائل

مسائل کی تحریکی اہمیت

اس میں کوئی شک نہیں کہ تحریک اسلامی کے لیے اصل مرکز توجہ تو دو ہی مسئلے ہیں: عام بندگان خدا تک دین حق کا پیام پہنچانا اور اپنے ارکان کی فکری، ایمانی، جذباتی اور عملی تربیت کرنا، لیکن بعض وجوہ سے یہ ان اہم مسائل کو بھی نظر انداز نہیں کرتی جن سے ملت یا ملک اس وقت عملاً دوچار ہیں۔ ان وجوہ کی ضروری وضاحت مختصر لفظوں میں یہ ہے:

(۱) پہلی وجہ تو خود اس تحریک کے اپنے مفاد کی ہے۔ یہ تحریک، ظاہر ہے کہ اپنی جدوجہد خلا میں نہیں چلا رہی ہے، کہ اس زمین پر جو کچھ ہو رہا ہے اس سے نہ اس کا کوئی واسطہ ہو، نہ اس کے مستقبل پر اس کا کوئی اثر پڑتا ہو۔ اس کے بخلاف یہی دنیا اور یہی مشغول زندگی تو اس کا میدان کار ہے، اسی میں یہ اپنا مطلوبہ نظام حق قائم کرنا چاہتی ہے اور اسی سے تعلق رکھنے والے انسان اس کے مخاطب ہیں، جن کی دین اور خدا سے ذہنی، فکری، قلبی اور عملی وابستگی اسے مطلوب ہے۔ عقل کا صریح تقاضا جس طرح یہ ہے کہ وہ اس وابستگی کو پیدا کرنے کے لیے اپنی توانائیوں، اپنی کوششوں اور اپنی حکیمانہ تدبیروں کا بھرپور استعمال کرتی رہے، اسی طرح یہ بھی ہے کہ ملت اسلامیہ کے اندر اس دور زوال میں بھی جس قدر اسلام اور قرآن سے وابستگی باقی رہ گئی ہے، اس کا اپنے مقدور بھر پورا پورا تحفظ کرتی رہے اور اس میں مزید انحطاط ہرگز نہ آنے دے۔ کیونکہ یہ وابستگی لاکھ ناقص اور خام سہی، مگر اس کے باوجود یہ دعوت کے لیے ایک بڑا قیمتی اثاثہ ہے۔ یہ اس 'خام مواد' کو اپنی جگر سوزیوں سے کام لے کر پختہ بنا سکتی ہے اور اگر یہ اس کی طرف سے آنکھیں

بند کیے رہتی ہے تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ جو اندرونی اسباب اس دینی زوال کے ذمہ دار ہیں انھیں اپنے عمل کے لیے بدستور کھلی چھٹی ملی رہے اور وہ اس زوال کی رفتار کو تیز سے تیز تر کرتے ہوئے اس وابستگی کو اور زیادہ بے جان بناتے چلے جائیں اور نتیجتاً تحریک کے لیے بھی اسے زیادہ سے زیادہ ناکارہ بنا کر رکھ دیں۔ بدیہی طور پر یہ انتہائی بے دانشی اور عاقبت نااندیشی کی بات ہوگی۔ اس بے دانشی اور عاقبت نااندیشی کی خوفناکی کا صحیح اندازہ لگانا شاید مشکل ہی ہوگا جب تک کہ ان اسباب وعوامل کا کھلی آنکھوں جائزہ نہ لے لیا جائے جو اس وقت خصوصیت سے اسلامی افکار، اسلامی اقدار اور اسلامی تصورات کے خلاف نبرد آزما ہیں اور اس نبرد آزمائی کے سلسلہ میں وہ حاکمانہ اختیارات کی طاقتوں سے بھی پوری طرح مسلح ہیں۔ صورت واقعہ یہ ہے کہ اس سلسلے میں مسلمانوں کی اپنی جو کوتاہیاں اور بے پروائیاں تھیں وہ تو تھیں ہی، مگر آزادیٔ ہند کے بعد ملکی حکومت نے جو تعلیمی پالیسیاں اور ثقافتی اسکیمیں یہاں رائج کر رکھی ہیں وہ ان کی رہی سہی دینی وابستگی اور اسلامیت کو جونک بن کر لپٹ گئی ہیں، جو اس کا آخری قطرۂ خون چوس لینا چاہتی ہیں۔ جب صورت حال یہ ہو تو وہ تحریک اس کی خاموش تماشائی کیسے بنی رہ سکتی ہے جو پوری انسانیت کے رگ وپے میں خدا پرستی کی رَو دوڑا دینا چاہتی ہو اور پوری انسانی زندگی کو اسلام کے رنگ میں رنگ دینا چاہتی ہو! موجودہ نظام حکومت کے یہ اقدامات تو اس کے خلاف فی الواقع ایک زبردست اور مستقل حملے کی حیثیت رکھتے ہیں، جس کا دفاع کرنا اس کی اولین ضرورتوں میں سے ایک اہم ضرورت ہے۔ ورنہ اگر یہ صرف مثبت دعوتی سرگرمیوں ہی پر اکتفا کیے رہتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ جب تک یہ اپنے محدود ذرائع سے کام لیتے ہوئے چند ذہنوں میں حق کا اجالا پیدا کر پائے گی، اتنی دیر میں حکمراں نظام کے طاقتور اور ہمہ گیر ذرائع ہزاروں ذہنوں میں باطل کی تاریکیوں کا خوفناک حد تک اضافہ کر دیں گے۔ اس لیے یہ بات تحریک اسلامی کے اپنے عین مفاد اور مستقبل کا ناگزیر فطری تقاضا ہے کہ یہ ایسے تمام اقدامات کا پوری شدت سے مقابلہ کرے، اور برابر کرتی رہے، جو ملت کے رہے سہے دینی تعلق پر شب خون مار رہے ہوں۔

(۲) دوسری وجہ یہ ہے کہ اسلام نے اپنے پیرووں پر، ان کے اپنے دینی بھائیوں کے بھی اور دوسرے بندگان خدا کے بھی بہت سے حقوق عائد کیے ہیں، جن کا ادا کرنا تقاضائے دین وایمان ہے۔ مثلاً ناداری کی حالت میں ان کی مدد کرنا، بے کسی اور ناطاقتی کی حالت میں ان

کے حقوق کا تحفظ کرنا، مصیبت کے وقت ان کی دست گیری کرنا، مظلومی کی حالت میں ان کی مدافعت، حفاظت اور دادرسی کرنا، بھلائی اور تعمیر کے کاموں میں ان سے تعاون کرنا، یہ اور اسی طرح کے بہت سے کام ایسے ہیں جو مسلمان کے فرائض میں شامل ہیں۔ اس لیے تحریک اسلامی سے وابستہ افراد ان فرائض کی ادائی سے کسی حال میں بھی صرف نظر نہیں کرسکتے۔ بلکہ دین کے داعی ہونے کا تقاضا تو یہ ہے کہ وہ عام مسلمانوں سے بڑھ کر ادائے حقوق کے اس دینی فریضے کو ادا کریں۔ خصوصاً یہاں کے غیر معمولی حالات میں تو ان فرائض سے صرف نظر کرنا ایمانی بے حسی کی دلیل ہوگی۔ اور یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ ایک اسلامی تحریک ــــــ اقامت دین کی تحریک۔ ہر شے سے محروم ہوکر تو اسلامی تحریک باقی رہ سکتی ہے، لیکن اپنے علم برداروں اور کارکنوں کی، ایمانی حس سے محرومی کے بعد اسلامی تحریک ہرگز باقی نہیں رہ سکتی۔

مسائل کی طرف عملی توجہ کی محدودیت

یہ مسائل، جن سے اس وقت ملک وملت دوچار ہیں، تعداد میں بے شمار ہیں اور ان کی یہ کثرت خلاف توقع بھی نہیں ہے۔ خصوصاً ملت اسلامیہ کے لیے تو جتنے بھی مسئلے اور مشکلیں پیدا ہوگئی ہوں، کم ہی سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ایک غیر اسلامی نظام حکومت میں مسلمان اور اسلام کے لیے قدرتی طور پر مسائل ہی مسائل پیدا کردیا کرتا ہے، زندگی کی کوئی کَل ایسی نہیں رہ جاتی جسے وہ سیدھی رہنے دیتا ہو۔ اس لیے اگر آج ملک کے لیے بالعموم اور مسلمانوں کے لیے بالخصوص، مسئلوں کا انبار لگا ہوا ہے تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔

مسائل کی اس ساری کثرت اور اہمیت کے باوجود، تحریک انھیں اپنی عملی توجہات کا اصل موضوع نہیں بنا سکتی جن کے کئی اہم وجوہ ہیں: سب سے پہلی اور بنیادی وجہ تو بالکل ظاہر ہی ہے، یعنی یہ کہ تحریک اسلامی کا اصل موضوع اور حقیقی مرکز توجہ اللہ کے دین کی تبلیغ وتلقین اور اپنے کارکنوں کی تربیت ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مسائل کا پائیدار اور صحیح حل بھی فی الواقع اسی دعوت کی کامیابی ہی پر موقوف ہے۔ اس کے بغیر چاہے جتنی بھی تدبیریں اور کوششیں اختیار کی جائیں، ان مسئلوں کی شدت کو صرف کم کیا جاسکتا اور ان کا عارضی اور جزئی حل ہی نکالا جاسکتا ہے، پورے اور کامیاب حل کا نکلنا کسی طرح ممکن نہیں۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ جہاں تک اس جزئی اور عارضی حل کا

تعلق ہے، اس کے لیے جدوجہد کرنے والوں کی کوئی کمی بھی نہیں ہے، بلکہ کتنی ہی تحریکیں اور جماعتیں ایسی ہیں جو مستقلاً اسی کام کے لیے قائم ہیں، جب کہ اقامت دین کے بنیادی کام اور حقیقی نصب العین کے لیے حرکت وعمل کے میدان میں کوئی دوسری آواز بالکل نہیں سنائی دے رہی ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ تحریک اسلامی کے اپنے وسائل وذرائع ابھی تک بہت محدود ہیں۔

اس پوری صورت حال کا اور ان سارے وجوہ واسباب کا تقاضا واضح طور پر یہ ہے کہ تحریک اسلامی ان مسائلِ ملک وملت کی طرف ایک خاص حد کے اندر ہی توجہ کرے اور انھیں اپنے پروگراموں میں عام طور سے ثانوی مقام ہی پر رکھے۔

مسائل کی اصولی تقسیم

اِن مسائل کی طرف توجہ کی، اس نے جو خاص حد متعین کی ہے، اس کے لیے قدرتی طور پر دو باتوں کو بنیاد بنایا ہے: ایک تو اپنی طاقت کے سرمائے کو، دوسرے ان مسائل کی اہمیتوں کے مدارج کو یعنی جہاں اس نے اس امر کو نگاہ میں رکھنا ضروری سمجھا کہ اس کے اپنے وسائل و ذرائع کا کیا حال ہے اور ان کا کتنا حصہ ان مسائل کے سلسلے میں صرف کرنا صحیح اور مناسب ہوگا، وہیں اس بات کا جائزہ لینا بھی ناگزیر خیال کیا کہ ملک اور ملت کو جو بے شمار مسائل اپنی گرفت میں لیے ہوئے ہیں ان میں کون کس اہمیت کا حامل ہے؟ کون سے مسئلے اپنے اثرات کے لحاظ سے زیادہ خطرناک ہیں اور کون نسبتاً کم؟ نظام حاضر کی نافذ کی ہوئی کون سی اسکیمیں اور پالیسیاں اور ملکی حالات کی پیدا کی ہوئی کون سی مشکلات ہمارے مستقبل پر مخالفانہ اثر زیادہ گہرا ڈالنے والی ہیں اور کون سی ایسی ہیں جو اس حد تک طاقتور اور موثر نہیں ہیں؟ ان دونوں ہی باتوں کا تفصیلی جائزہ لینا ان مختلف النوع مسائل کے بارے میں صحیح، معقول اور متوازن طرز عمل اختیار کرنے کے لیے واضح طور پر بالکل ضروری تھا۔ چنانچہ اس دوطرفہ جائزے کی روشنی میں اس نے پہلے تو ان مسائل کو زیادہ اہم مسائل اور کم اہم مسائل کی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے، اور پھر ان میں سے ہر ایک کے لیے اپنی توجہ کی نوعیتیں بھی، حسب تناسب الگ الگ تجویز کر رکھی ہیں۔ پہلی قسم کے مسائل تو اس کی عملی توجہ اور سعی جدوجہد کے دائرے میں شامل ہیں، جب کہ دوسری قسم کے مسائل کے سلسلے میں اس کی توجہات صرف خیالات اور جذبات کے اظہار ہی تک محدود ہیں۔

لیکن اس کی وجہ یہ ہر گز نہیں ہے کہ یہ ان مسائل کی کما حقہ اہمیت کا احساس نہیں رکھتی ، یا انھیں ملک کے لیے ، ملت کے لیے اور خود اپنے لیے کوئی بڑا مسئلہ نہیں سمجھتی ، بلکہ یہ ہے کہ اس کی قوت کار ان مسائل کے بارے میں کسی عملی جدوجہد کی اس وقت اجازت ہی نہیں دے رہی ہے۔ یہ قوت کار اگر کافی ہوتی اور تحریک کے ذرائع ہمہ گیر حدوں تک پہنچ چکے ہوتے ، تو یقیناً ان سب مسائل کو بھی اپنے دائرہ عمل میں شامل کر لیتی ۔ لیکن اپنے ذرائع و وسائل کے موجودہ احوال میں یہ ایسا سوچ ہی نہیں سکتی ۔ ورنہ کاموں کا پھیلاؤ اس کی توانائیوں کو ہضم کر جائے گا اور اس کی عملی سرگرمیاں بے شمار محاذوں پر بٹ کر بڑی حد تک بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گی۔

(ا) اہم تر مسائل

پہلی قسم کے مسائل ، جنھیں ان کی غیر معمولی اہمیت کی بنا پر تحریک اسلامی نے اپنی عملی جدوجہد کے دائرے میں شامل کر رکھا ہے ، یہ ہیں :

(۱) بڑے پیمانے پر ابتدائی دینی تعلیم کی ترویج۔

(۲) جبری تعلیم کے موجودہ سرکاری نظام سے مسلمان بچوں کا استثناء۔

(۳) سرکاری نصاب ہائے تعلیم کی اصلاح۔

(۴) مسلم پرسنل لاء یا صحیح تر لفظوں میں مسلمانوں کی نجی زندگی سے تعلق رکھنے والے اسلامی قوانین کا تحفظ۔

(۵) مسلمانوں میں دینی بیداری کا اور اپنے فرض منصبی کے احساس کا فروغ۔

(۶) خدمت خلق۔

(۷) فرقہ پرستی کی بیخ کنی اور قوم پرستانہ کش مکش کی روک تھام۔

(۸) ملک میں معروف (خیر پسندی اور نیکی) کا قیام اور منکرات (مادیت ، بدکرداری اور برائی) کا ازالہ۔

(۹) مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ۔

ان مسائل کو اہم تر کیوں قرار دیا گیا ہے ، اس کے وجوہ واسباب تھوڑے ہی سے غور و فکر کے بعد آپ سے آپ واضح ہو جائیں گے۔

● ابتدائی دینی تعلیم کی ترویج کی غیر معمولی اہمیت تو روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی نئی نسلوں کا مسلمان رہنا بنیادی طور پر ان کی دینی تعلیم وتربیت ہی پر موقوف ہے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی حقیقت نہیں کہ مسلمانوں کی نئی نسل جس حد تک فی الواقع مسلمان ہوگی اسی حد تک ان کے اندر خودشناسی اور اپنے فرض منصبی کا احساس موجود ہوگا اور پھر ان کے اندر جس قدر یہ احساس موجود ہوگا اسی قدر تحریک اسلامی کی دعوت بھی ان کے دلوں کی آواز بن سکے گی۔ اس لیے مسلمان بچوں کے لیے صحیح دینی تعلیم کا ہمہ گیر نظام قائم کرنا بجائے خود ایک اہم ملی ضرورت ہونے کے ساتھ ساتھ دعوت کی اپنی بھی ایک اہم ضرورت ہے۔

● جبری تعلیم کے موجودہ سرکاری نظام سے مسلمان بچوں کو مستثنیٰ کرانے کی جدوجہد دراصل انھیں تہذیبی اور دینی ارتداد کے شدید خطرات سے بچالینے کی جدوجہد ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ یہاں کی قریب قریب سبھی ریاستی حکومتوں نے ایسے تعلیمی نصاب جاری کر رکھے ہیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے انتہائی خطرناک ہیں۔ وہ ایسی کتابوں پر مشتمل ہیں جن میں ایک طرف تو مشرکانہ عقائد وافکار کو بری طرح سمودیا گیا ہے، دوسری طرف وہ مسلمانوں سے نفرت اور بیزاری پیدا کرنے والے مواد سے بھی خالی نہیں ہیں۔ پھر مزید ستم یہ کہ ان نصابوں کا پڑھانے والا اسٹاف بھی اٹھانوے فی صدوہ ہے جو ان عقائد وافکار اور دیو مالائی تصورات سے اعتقادی وابستگی رکھتا ہے۔ اس لیے اس سے توقع اسی بات کی کی جاسکتی ہے کہ وہ طلبہ کو صرف پڑھائے گا ہی نہیں بلکہ انہی عقائد وتصورات کے مطابق ان کی ذہنی تربیت بھی کرے گا۔ اب ظاہر ہے کہ اس تعلیم اور اس تربیت کا مسلمانوں کے حق میں جو نتیجہ نکل سکتا ہے وہ تشویش ناک ہی نہیں اندوہناک بھی ہوگا۔ ان کے ذہن کے سادہ اور بے رنگ پردوں پر اگر مسلسل چھ برسوں تک دیو مالائی تصورات اور مشرکانہ عقائد کی پھواریں ڈالی جاتی رہیں گی تو وہ جس طرح کے مسلمان بن کر اٹھیں گے اس کا اندازہ لگالینا ذرا بھی مشکل نہیں۔ آج کے مسلمان اسلام سے بہت نابلد، جاہل اور ان پڑھ ہیں، مگر یہ جاہل اور ان پڑھ مسلمان اسلام سے جتنے نابلد اور اس کے عملی تقاضوں سے جس قدر دور ہیں، کل کے یہ پڑھے لکھے مسلمان ان سے بھی زیادہ نابلد اور دور نظر آئیں گے۔ حکومت کی اس تعلیمی اسکیم کا جبری نفاذ بہت دنوں سے ہو چکا ہے اور محض مالی مشکلات کی وجہ سے وہ ابھی تک ملک گیر حیثیت نہیں اختیار کرسکا ہے۔ لیکن یہ بات اپنی جگہ بالکل طے شدہ ہے کہ جس قدر جلد

ممکن ہوگا، حکومت اسے ملک کے گوشے گوشے میں نافذ کردینے کا عزم بھی رکھتی ہے اور یہ اس کی دستوری ذمہ داری بھی ہے۔ ایسی حالت میں بالکل ضروری ہے کہ شرک والحاد کی اس یلغار سے مسلمان بچوں کو پوری طرح محفوظ کرلیا جائے، جس کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتی کہ انھیں اس اسکیم کے نفاذ سے مستثنیٰ کرالیا جائے تاکہ کوئی بھی مسلمان بچہ تعلیم و تربیت کے اس خطرناک نظام کے تحت تعلیم حاصل کرنے پر مجبور نہ کیا جاسکے۔ ورنہ اسلام سے بے گانگی اور ذہنی ارتداد کی وبا پھوٹ پڑے گی، جو بدیہی طور پر اسلام کے حق میں بدترین المیہ ثابت ہوگی اور پھر یہ چیز لازماً تحریک اسلامی کے مستقبل کو بھی ناسازگار اور خطرناک صورت حال سے دوچار کردے گی۔ کیونکہ ایسی حالت میں اس کے اصول و مقاصد سے کل کے مسلمانوں کا ذہن آج کے مسلمانوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ نامانوس ہوگا۔ اس لیے مسلمان بچوں کو سرکاری نظام تعلیم کی اس جبری اسکیم سے مستثنیٰ کرالینا یقینی طور پر وقت کی ایک اہم ترین ضرورت ہے۔ یہاں تک کہ ابتدائی دینی تعلیم کی توسیع سے بھی اس کی اہمیت اور ضرورت بڑھی ہوئی ہے۔ کیونکہ اس دینی تعلیم کی توسیع کا فائدہ بھی اسی وقت حاصل ہوسکتا ہے جب مسلمان بچے سرکاری اسکولوں میں داخلے کے لیے قانوناً مجبور نہ کیے جارہے ہوں ورنہ آزاد دینی مکاتب میں جب داخلے کی آزادی ہی نہ ہوگی تو ان میں پڑھے گا کون؟

● سرکاری نصاب تعلیم کی اصلاح کی ضرورت کا تعلق بھی حکومت کی جبری تعلیمی اسکیم کے نفاذ سے پیدا ہونے والے انہی خطرات میں سے ہے جن کی وضاحت ابھی سامنے آچکی ہے اور یہ اس لیے کہ اس اسکیم کے نفاذ سے مسلمان بچوں کو قانوناً مستثنیٰ کرالینے کی کامیاب جدوجہد کے بعد بھی مذکورہ خطرات کا پورا پورا سدباب نہیں ہوسکتا۔ کیونکہ اس استثناء کے بعد بھی مسلمان بچوں کی ایک بھاری تعداد ایسی یقیناً باقی رہ جائے گی جو کسی آزاد دینی مدرسے میں داخلے کی سہولت نہ پاسکے گی اور سرکاری اسکولوں ہی میں پڑھنے کے لیے مجبور ہوگی۔ مسلمان اپنے لاکھوں بچوں کے لیے کافی آزاد دینی مکاتب بھی قائم کرلیں گے اور ان میں سے ہر شخص اتنی ایمانی حرارت کا ثبوت بھی دے دے گا کہ وہ سرکاری اسکولوں میں داخلے کی سہولتوں اور فائدوں کو ٹھکرا کر اپنے بچوں کو لازماً کسی دینی مدرسے ہی میں داخل کرائے گا، عملاً اس کی توقع کسی طرح بھی نہیں کی جاسکتی۔ اس لیے اس تعلیمی اسکیم کے ایمان سوز اثرات سے بچوں کو محفوظ رکھنے کے لیے

جہاں بنیادی ضرورت اس بات کی ہے کہ مسلمان بچوں کو اس اسکیم کے نفاذ سے مستثنیٰ کرالیا جائے، وہیں دوسری ضرورت اس امر کی بھی ہے کہ جو بے شمار بچے پھر بھی ان سرکاری اسکولوں ہی میں داخلہ لیتے رہیں گے ان کے لیے اس نصاب کی دینی اور ایمانی مضرتوں کو تاحد امکان دور کرادیا جائے اور اسے زیادہ سے زیادہ گوارا کے قابل بنوالیا جائے۔ صرف گوارا کے قابل بنوا لینے کی بات اس لیے کہی جا رہی ہے کہ ایک سیکولر نظام کا بنایا ہوا نصاب تعلیم ہزار خوبیوں کے باوجود دینی نقطۂ نگاہ سے قابل اطمینان تو کبھی ہو ہی نہیں سکتا، اگر ہوسکتا ہے تو صرف گوارا کے قابل ہی ہوسکتا ہے۔

● ''مسلم پرسنل لا کے تحفظ'' کا مسئلہ بھی ایک معنی میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو حکومت کی جبری تعلیم کے مفاسد سے مسلمان بچوں کو محفوظ رکھنے کے مسئلہ کی ہے۔ صورت حال یہ ہے کہ مسلمان ایک غیر اسلامی نظام حکومت کے تحت زندگی بسر کرنے کے باعث اپنے دین کے سارے اجتماعی احکام کی پیروی سے تو محروم تھے ہی اور اس طرح ان کی زندگی اجتماعی دائروں میں سرتا سر غیر اسلامی بن ہی چکی تھی مگر اب ان کی نجی زندگی کی بھی رہی سہی اسلامیت کے لالے پڑتے نظر آ رہے ہیں۔ ملک کا دستور ہدایت کرتا ہے اور حکومت اس ہدایت پر عمل کرنے کے لیے بری طرح بے قرار ہے، کہ بلاتفریق مذہب وملت یہاں کے سارے باشندوں کے لیے یکساں سول کوڈ بنا کر نافذ کردیا جائے۔ حکومت اگر اپنے اس ارادے میں کامیاب ہوگئی تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ مسلمانوں کی زندگی پر نکاح، طلاق، خلع، عدت، وراثت، وصیت اور وقف وغیرہ کے معاملات میں اسلامی احکام کا جو کچھ عملی نفاذ ابھی تک باقی رہ گیا ہے اب یہ آخری نشان بھی مٹ کر رہ جائے، وہ حدود و شرائط غیر ضروری بلکہ غیر معتبر قرار پائیں جنھیں کتاب وسنت نے ان معاملات کے ضمن میں ضروری ٹھہرا رکھا ہے۔ مثلاً ہوسکتا ہے کہ نکاح کے لیے اسلام اور ایمان کی شرط بھی غیر قانونی قرار پا جائے (حالانکہ قرآن نے غیر مسلم سے نکاح کو قطعی حرام فرمایا ہے) ناگزیر حالات اور مصالح کے وقت بھی ایک سے زائد شادیاں ممنوع ہو جائیں (جب کہ شریعت نے اس کی اجازت دے رکھی ہے) طلاق کا اختیار مرد کے ہاتھ سے چھین کر کسی سرکاری ادارے کے حوالے کردیا جائے یا اس معاملے میں مرد اور عورت دونوں کو یکساں صاحب اختیار بنا دیا جائے (حالانکہ شرعاً یہ حق یا اختیار صرف مرد کو حاصل ہے) ترکے کی تقسیم میں متوفی کے لڑکوں اور لڑکیوں، دونوں کے حصے برابر ٹھہرا دیے جائیں (جب کہ اللہ کی کتاب نے لڑکوں کا حصہ صراحتاً

دو چند قرار دیا ہے) غرض یکساں سول کوڈ بن جانے کی شکل میں اس طرح کے بے شمار امکانات موجود ہیں اور قطعیت کے ساتھ موجود ہیں۔ یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ خدانخواستہ فضا میں کوندنے والی یہ بجلی اگر مسلمانوں کے سر پر گرگئی تو اس کا نتیجہ کیا ہوگا! اس کا نتیجہ واضح طور پر یہ ہوگا کہ مسلمانوں کے اپنے دین سے ذہنی اور عملی رشتے جو اس وقت بھی نیم جان ہیں، جاں بلب ہو کر رہ جائیں، اور ان کا رہا سہا ملی اور تہذیبی تشخص، مسجدوں سے باہر، شاید نام کو بھی باقی نہ رہ جائے۔ کیونکہ کسی گروہ کے اپنے مخصوص پرسنل لا پر اس کی ملی انفرادیت اور تہذیبی تشخص کا اتنا فیصلہ کن انحصار ہوتا ہے کہ اس کے مٹا دیے جانے کے بعد اس کے نقوش بھی باقی نہیں رہ جاتے۔ اس لیے مسلم پرسنل لا کو ختم کر دیے جانے کی تجویز دراصل اس سرزمین میں اسلام کے بچے کھچے حصے کو بھی ڈھا دینے کی تجویز ہے، جسے وہ تحریک خود اپنے لیے ایک راست چیلنج ہی تصور کر سکتی ہے جس کا نصب العین ہی دین کے اب تک ڈھے چکنے والے سارے حصوں کو بھی پھر سے قائم کر دینا ہو۔

- مسلمانوں میں دینی بیداری اور اپنے فرض منصبی کا فروغ دراصل تحریک اسلامی کے لیے میدان ہموار کرنے کا ہی دوسرا نام ہے۔ اس لیے اسے فی الواقع دعوت ہی کا کام سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ مسلمان اپنے دین سے جس قدر قریب آئیں گے اسی قدر اس دعوت سے بھی قریب ہو جائیں گے۔ اس لیے اس کی یہ کوشش بالکل فطری بھی ہے اور ضروری بھی، کہ ان کے اندر اسلام کا صحیح علم پھیلے وہ دین کے مزاج شناس بنیں، ان کے افکار و اعمال سچی خدا پرستی کے سانچے میں ڈھلیں، وہ سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیں اور اس طرح ان کی مجموعی زندگی اس ملک میں اسلام کی بہتر سے بہتر شہادت دینے کے قابل ہوتی چلی جائے ورنہ دین سے کم اعتنائی کی ان کی موجودہ روش اس تحریک کے لیے بھاری رکاوٹ بنی رہے گی۔

- ''خدمتِ خلق'' ایک طرف تو اس جذبۂ انسانیت، جذبۂ اخوت اور جذبۂ مرحمت و مواسات کا عملی مظہر ہے جو اسلام کی بنیادی اخلاقیات میں انتہائی نمایاں مقام رکھتا ہے، یہاں تک کہ ایمان اور بندگانِ خدا کے دکھ درد سے بے نیازی یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو ہی نہیں سکتیں۔ دوسری طرف اس عمل کے اندر دلوں کو جیت لینے کی بے نظیر صلاحیت بھی ہوتی ہے۔ اس لیے تحریک اسلامی کے لیے اس کی اہمیت اصولی اور مقصدی، دونوں پہلوؤں سے مسلم ہے۔ پس اس کے ارکان کا اس ضروری دینی وصف سے بے بہرہ رہنا قابل تصور بھی نہیں ہوسکتا، جیسا کہ کسی بھی

سچے پیرو اسلام کا نہیں ہوسکتا۔ جب حقیقت واقعی یہ ہے تو یہ نہ کوئی ملی یا ملکی مسئلہ ہے نہ پالیسی کا سوال ہے، کہ تحریک اسلامی اپنے کارکنوں کو اس کے بارے میں کوئی ہدایت دینے کی مجاز یا ضرورت مند ہو۔ یہ خدمت خلق تو مسلمان اور متبع اسلام ہونے کی حیثیت سے ان کا دینی فریضہ ہے، جسے وہ اپنے ایمان کا تقاضا سمجھ کر از خود انجام ہی دیں گے۔

البتہ اس معاملے کا ایک پہلو ایسا ضرور ہے جو تحریک کے جماعتی نظام کے طے کرنے کا ہے اور وہ یہ کہ اس فرض کو لوگ صرف اپنے طور پر اور اپنی انفرادی حیثیتوں ہی میں ادا کرتے رہیں یا اس کے لیے جماعتی نظم کے تحت کوئی اجتماعی طریقہ بھی اپنانا چاہیے؟ اس پہلو سے یہ مسئلہ ملی اور ملکی مسئلہ بھی بن جاتا ہے اور اگر تحریک اسلامی نے خدمت خلق کے کام کو ایک ملی اور ملکی مسئلے کی حیثیت سے اپنے پروگرام میں شامل کیا ہے تو اسی پہلو سے اور اسی معنی میں شامل کیا ہے۔ اس کے اس فیصلے کی وجہ یہاں کے وہ حالات ہیں جن سے ملت کو بالخصوص اور پورے ملک کو بالعموم سابقہ پیش آتا رہتا ہے۔ مثلاً مسلمانوں کے خلاف آئے دن کی فرقہ وارانہ جارحیت جس میں وسیع پیمانے پر قتل و غارگری کے حادثات رونما ہوتے رہتے ہیں، یا کبھی سیلاب کی اور کبھی خشک سالی کی پیدا کی ہوئی مصیبتیں، جو ملک کے طول و عرض میں تباہیاں مچادیا کرتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے غیر معمولی حالات میں لوگوں کی کوئی قابل لحاظ خدمت اور مؤثر مدد انفرادی توجہات سے ہرگز نہیں انجام پاسکتی۔ اس کے لیے تو زیادہ سے زیادہ منظم جدوجہد ہی کچھ نتیجہ خیز ثابت ہوسکتی ہے۔

● ''فرقہ پرستی کی بیخ کنی اور قومی کش مکش کی روک تھام'' تحریک اسلامی کے لیے دوگونہ اہمیت رکھتی ہے۔ ایک تو یہ کہ یہ فرقہ پرستی اور قومی کش مکش ایسی خطرناک برائی ہے جو انسانیت، بھائی چارہ، انصاف، حق شناسی اور ایثار کی بنیادی اخلاقی قدروں کو آگ کی طرح کھا جاتی ہے۔ کہنا چاہیے کہ یہ برائی صرف ایک برائی نہیں ہے، بلکہ بے شمار برائیوں کی ماں ہے۔ جس معاشرے کو یہ روگ لگا ہوا ہو اس میں نیکیاں کبھی جڑ پکڑ ہی نہیں سکتیں۔ اس لیے تحریک اسلامی، جس کا بنیادی مشن ہی برائیوں کو مٹانا اور نیکیوں کا راج قائم کرنا ہے، اسے کبھی برداشت نہیں کرسکتی اور اسے ہلاک کردینا اپنا اولین فریضہ ہی سمجھ سکتی ہے۔ دوسرے یہ کہ فرقہ پرستی اور قومی کش مکش بجائے خود اس دعوت کی راہ کا ایک بھاری پتھر اور اس کے لیے فضا کو انتہائی حد تک ناسازگار اور مسموم بنادینے والا اندھا فتنہ ہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں انسانی ذہن کو سخت ہیجان میں مبتلا

کیے رہتی ہیں اور اسے انصاف اور حق پسندی کے جوہر سے بے بہرہ بنا کر رکھ دیتی ہیں۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایک طرف تو اس فضا میں غیر مسلموں کے لیے اسلام کا پیغام ناگواری، نفرت اور غضب کا سبب بن جاتا ہے، دوسری طرف مسلمان بھی اس سے انقباض محسوس کرتے رہتے ہیں۔ اس لیے اگر تحریک اسلامی ان شیطانی فتنوں کی طرف سے آنکھیں بند رکھتی ہے تو اپنے مستقبل کو یقینی طور پر کانٹوں سے بھر لے گی۔ بنابریں بالکل ناگزیر ہے کہ اپنے بس بھر وہ ان بدترین اخلاقی امراض کی جڑیں کاٹ دینے کے سلسلے میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھے۔

● ''معروف کے قیام اور منکرات کے ازالے'' کا مطلب یہ ہے کہ معاشرے کو عام اور مسلمہ برائیوں سے پاک اور نیکیوں سے آراستہ کر دیا جائے۔ تحریک اسلامی کے لیے اس کام کی جو اہمیت ہے وہ کسی وضاحت اور دلیل کی محتاج نہیں۔ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ معاشرے پر جس قدر شر کا غلبہ ہوگا تحریک کے لیے کامیابی کے امکانات اتنے ہی تاریک ہوں گے اور اس میں خیر پسندی کا جوہر جتنا ہی زیادہ ہوگا تحریک کے لیے کامیابی کے امکانات اتنے ہی روشن ہوں گے۔ اس وقت ملک کی اخلاقی حالت جیسی کچھ ہے اور ہوتی جا رہی ہے، اسے ہر دیکھنے والی آنکھ دیکھ ہی رہی ہے۔ یہاں کے نادان اور برخود غلط رہنماؤں نے تعمیر و ترقی کا جو خالص مادی منصوبہ بنا رکھا ہے، دین و اخلاق کو جس بیدردی سے انھوں نے دیوار پر دے مارا ہے اور سرکاری خزانے کا پیٹ بھرنے کے نام پر شراب جیسی ام الخبائث کی بھی علانیہ خرید و فروخت تک سے کام لینے کا جو اندازِ بیان وعمل اختیار کر رکھا ہے اس کے نتیجہ میں ملک بے کرداری کی دلدل میں بری طرح دھنستا جا رہا ہے۔ اسے روحانیت کا گہوارہ ہونے کا دعویٰ تھا، لیکن اس وقت جدھر دیکھیے نفسیانیت اور دنیا پرستی کا طوفان امنڈ رہا ہے۔ اللہ والوں اور دین داروں کے خلف خداناشناس اور دین بیزار بن رہے ہیں، بھگتوں اور دھرماتماؤں کی گود سے بھگتی اور دھرم کا مذاق اڑانے والی نسل اٹھ رہی ہے۔ روحانیت مادہ پرستی کے لیے، فکرِ آخرت حرصِ دنیا کے لیے، جذبۂ ایثار و مروت خودغرضی کے لیے، دیانت داری بے ایمانی کے لیے، ضبطِ نفس اور پاک نفسی نفس پرستی اور عیاشی کے لیے، انصاف اور حق شناسی ظلم اور حق تلفی کے لیے، پاس عہد دجل وفریب کے لیے، غرض ہر قسم کا خیر، شر کے لیے تیزی سے جگہ خالی کرتا جا رہا ہے۔ یہ نامبارک صورت حال تحریک اسلامی کے لیے ایک راست چیلنج ہی کہی جا سکتی ہے، جس سے وہ کسی حال میں بھی پہلو نہیں بچا سکتی۔ اگر

بچائے گی تو خود اپنی راہ میں مشکلات کے پہاڑ کھڑے کرلے گی۔ اس لیے اس کے پروگرام میں معروف کے قیام اور منکرات کے ازالے کا کام بھی شامل ہے تو فطری طور پر ایسا ہونا ہی چاہیے تھا۔

● ''مسلمانوں کی جان و مال کا تحفظ'' وقت کا جتنا اہم، جتنا ابھرا ہوا اور جتنا سنگین مسئلہ ہے، اس پر کچھ کہنے کی مطلق ضرورت نہیں۔ یہ ملک ہندوستان اپنی آزادی کے بعد ہی سے ان کے لیے مصائب کی بھٹی بنا ہوا ہے اور آئے دن ان کی جانوں اور جائدادوں پر جارحانہ فسادات کی بجلیاں گرا کرتی ہیں۔ وجہ اس کی جو کچھ بھی ہو، لیکن تحریک اسلامی سے بہر حال اس کا کھلا ہوا دینی مطالبہ ہے کہ وہ ان کے تحفظ کے لیے جو کچھ ہو سکے ضرور کرے۔

عملی سرگرمیوں کا خاکہ

ان اہم تر مسائل کے سلسلے میں تحریک اسلامی جو کچھ اور جس نوعیت کی عملی جدوجہد کر رہی ہے اس کی ضروری تفصیل یہ ہے:

● ''ابتدائی دینی تعلیم کی توسیع'' کا مسئلہ اس کے نزدیک ان مسائل میں سرفہرست ہے اور اس کے متعلق اس نے اپنی سرگرمیوں کو حسب ذیل کاموں تک وسعت دے رکھی ہے:

(۱) ہائی اسکول تک کی تعلیم کے لیے صحیح اسلامی نصاب کی تیاری۔ 'صحیح اسلامی نصاب' کا مفہوم یہ ہے کہ مضامین کے انتخاب اور کتابوں کی تیاری میں مقصد تعلیم اور فن تعلیم کے صحیح اسلامی نقطۂ نظر کو پوری وسعت اور گہرائی کے ساتھ سامنے رکھا گیا ہو، اس کے اندر دین اور دنیا کی تفریق کے عجمی اور غیر اسلامی نظریے سے پوری طرح اجتناب برتا گیا ہو، تاریخ، جغرافیہ، ادب، سائنس اور ریاضی وغیرہ علوم کو بھی، جنھیں عام طور سے خالص دنیوی اور دین سے یکسر غیر متعلق سمجھا جاتا ہے قرآن کی دی ہوئی بنیادوں پر اور اسلام کی زبان میں مرتب کیا گیا ہو، تاکہ ان مضامین کی تعلیم و تدریس بھی طلبہ کے ذہن کو فکر و نظر کا اسلامی انداز عطا کرتی رہے۔ غرض اس نصاب کی کتابیں فنی لحاظ سے بھی زیادہ سے زیادہ معیاری ہوں اور مقصدی طور پر بھی اتنی کامیاب ہوں کہ مسلمانوں کی نئی نسل کو تعلیمی اور علمی ذوق کے ساتھ ساتھ ایمان کی پختگی اور سیرت کی بلندی سے بھی بخوبی آراستہ کر سکیں۔

اس نوع کا نصاب تعلیم درجہ اول سے لے کر درجہ ششم تک قریب قریب مکمل حد تک

مرتب ہو چکا ہے اور ملک کی بے شمار درس گاہوں میں، کہیں پوری طرح اور کہیں جزئی طور پر، پڑھایا بھی جارہا ہے۔ باقی کی تیاری کی جارہی ہے۔

(۲) ایک ایسی معیاری درس گاہ کا قیام جہاں مذکورہ بالا نصاب کے مطابق مکمل تعلیم اور تربیت کا بہترین انتظام ہو، تاکہ وہ ایک نمونے کا کام دے سکے۔ یہ درس گاہ براہ راست تحریک کے مرکزی نظم کے تحت کافی دنوں سے قائم ہے۔ اس کے علاوہ بعض اور مقامات پر بھی اسی طرز کی درس گاہیں، مقامی جماعتوں کے زیرانتظام، مختلف سطحوں کی قائم ہیں۔

(۳) مسلمانوں کو اس بات کی مسلسل ترغیب کہ وہ بستی بستی اپنے آزاد دینی مکاتب قائم کریں، جہاں اس نصاب تعلیم کے مطابق یا پھر اپنی پسند کے کسی اور معیاری نصاب کے مطابق تعلیم اور تربیت کا انتظام ہو۔ چنانچہ وقت کی اس اہم ترین ملی و دینی ضرورت کی طرف پورے ملک میں تحریک کے پھیلے ہوئے کارکن اور اس کی مقامی اور حلقہ وار جماعتی تنظیمیں لوگوں کو برابر متوجہ کرتی رہتی ہیں اور حسب ضرورت اس کام میں انکی رہنمائی اور مدد سے بھی دریغ نہیں کرتیں۔ خدا کا شکر ہے کہ یہ کوششیں بارآور ثابت ہورہی ہیں۔ چنانچہ ان کے نتیجہ میں اچھی خاصی بڑی تعداد میں مدارس کھل گئے ہیں اور برابر کھلتے جارہے ہیں۔

(۴) دینی تعلیم کی توسیع کا کام کرنے والی دوسری جماعتوں سے تعاون، تاکہ یہ اہم کام زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ساتھ انجام پاسکے۔ اس ضمن میں سب سے اہم اور نمایاں مثال یہ ہے کہ اترپردیش کی دینی تعلیمی کونسل، یا انجمن تعلیمات دین کے قیام میں اس نے بھرپور حصہ لیا اور ابتدا ہی سے اس میں شرکت اختیار کررکھی ہے۔

(۵) سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں تعلیم پانے والے مسلمان طلباء کے لیے صباحی یا شبینہ دینی مکاتب قائم کرانے کی کوشش، تاکہ ان کو دین کی ناگزیر معلومات سے واقف کرادیا جاسکے اور اس طرح ان تعلیم گاہوں کے مضر اثرات کا بھی ایک حد تک تدارک ہوجایا کرے۔

● ''جبری تعلیم کی سرکاری اسکیم سے مسلمان بچوں کو مستثنیٰ کرانے'' کے لیے وہ حکومت سے پیہم مطالبے خود بھی کرتی رہتی ہے اور اس سلسلے میں دوسری جماعتوں سے تعاون بھی کرتی رہتی ہے۔ اس کا یہ مطالبہ نرا مطالبہ ہی نہیں ہوتا بلکہ اس کی پشت پر معقول وجوہ و دلائل بھی ہوتے ہیں۔ اس ضمن میں اترپردیش دینی تعلیمی کونسل کے پلیٹ فارم سے تھوڑی سی کامیابی بھی

ہو چکی ہے۔ چنانچہ یوپی گورنمنٹ کے محکمہ تعلیم نے اس بات کو تسلیم کرلیا ہے کہ دینی تعلیمی کونسل کے زیر اہتمام چلنے والے مکاتب میں جو بچے پرائمری درجات پاس کر چکیں گے انھیں ٹیسٹ کے بعد سرکاری اسکولوں کے درجہ ششم میں داخلہ مل سکے گا۔ گویا ان مکاتب کو رکگنائزڈ نہ ہونے کے باوجود ایک حد تک منظور شدہ تسلیم کرلیا گیا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ استثنا کے اصل مطالبے سے یہ بہت ہی کم درجے کی کامیابی ہے اور ابھی اس معاملے میں بہت کچھ کرنا ہے۔

● ''سرکاری نصاب تعلیم کی اصلاح وترمیم'' کے مسئلے کے حل کی راہ بھی قدرتی طور پر وہی ہوسکتی تھی جو مسلمان بچوں کو مستثنیٰ کرانے کے مسئلے کی تھی۔ چنانچہ تحریک نے اس کے لیے بھی ایک طرف مدلل افہام وتفہیم کی، دوسری طرف موثر احتجاج اور مطالبہ کی مہم جاری کر رکھی ہے۔ یہ مہم اپنے طور پر بھی چلائی جارہی ہے اور مشترک پلیٹ فارموں سے بھی۔

اس مہم کو مدلل اور موٴثر بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اس سلسلے میں جو بات بھی کہی، دلیل اور معقولیت سے کہی۔ اس نے اپنی حلقہ وار (صوبائی) تنظیموں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے یہاں کے سرکاری اسکولوں میں پڑھائی جانے والی کتابوں کا تفصیلی جائزہ لیں اور پھر ایسے تمام مواد کو چھانٹ کر مرتب شکل میں جمع کردیں جو اسلامی نقطۂ نظر سے قابل اعتراض ہوں، جن میں مشرکانہ عقائد یا دیومالائی خرافات مذکور ہوں، یا جن کے اندر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نازیبا خیالات کا اظہار کیا گیا ہو۔ جب پوری محنت اور چھان بین سے یہ کام انجام دیا جاچکا تو اسے سب کے سامنے، بالخصوص مرکزی اور ریاستی حکومتوں کے سامنے رکھ دیا گیا۔ پھر دوسری جماعتوں کے ساتھ وفود کی شکل میں ان ارباب اختیار سے ملاقاتیں بھی کی گئیں اور ان مستند دستاویزوں کے ذریعہ ان کے احساس ذمہ داری اور جذبۂ حق وانصاف کو خطاب کیا گیا۔ اگرچہ اس مسلسل چیخ وپکار اور افہام وتفہیم کا کوئی خاطر خواہ نتیجہ ابھی تک برآمد نہیں ہوسکا ہے، تاہم یہ بالکل ہی صدا بصحرا ابھی ثابت نہیں ہو رہی ہے۔ چنانچہ پارلیمنٹ میں خود ہندو ممبروں نے اس مسئلہ کو کئی بار پورے زور سے اٹھایا ہے۔ جس کے نتیجہ میں مرکزی حکومت نے ایک اعلیٰ سطح کی کمیٹی مقرر کردی ہے، جس کے ذمہ یہ کام ہے کہ وہ مختلف صوبوں میں پڑھائے جانے والے نصابوں کا گہری نظر سے جائزہ لے کر انھیں غیر فرقہ وارانہ اور سیکولر بنانے کی سفارشیں پیش کرے۔ اس کمیٹی کی کارکردگی کے بارے میں

اب تک جو اطلاعات ملی ہیں وہ توقع دلاتی ہیں کہ وہ صرف نام کی اور دکھاوے کی کمیٹی ثابت نہ ہوگی، بلکہ اس کی کوششیں کافی حدتک نتیجہ خیز ثابت ہوں گی خدا کرے کہ یہ توقع ناکام نہ ہو۔

● ''مسلم پرسنل لا کے تحفظ'' اور اسے حکومت کی دراندازیوں سے بچانے کے لیے تحریک اسلامی برابر چوکنی رہتی ہے۔اس نے جب بھی دیکھا کہ اس طرح کے کسی اقدام کے لیے براہ راست یا بالواسطہ زمین ہموار کرنے کی کوشش ہورہی ہے،تو فوراً اس کا نوٹس لیا اور سخت احتجاجات کیے۔چنانچہ اس کی مرکزی حلقہ وار اور مقامی تنظیمیں اس سلسلے میں برابر احتجاجی قراردادیں منظور کرتی رہتی ہیں اور اس زبردست خطرے کا مقابلہ کرنے کے لیے مسلمانوں کو خبردار اور مستعد رکھنے کی کوششیں انجام دیتی رہتی ہیں۔اس بارے میں تحریک کی جدوجہد کا آخری نشانہ دستور ہند سے اس رہنما اصول ہی کو حذف کرادینا یا اس کے اثر وعمل سے مسلمانوں کو مستثنیٰ کرالینا ہے جس میں پورے ملک کے لیے یونیفارم سول کوڈ بنانے کی ہدایت کی گئی ہے۔

یہ جدوجہد صرف احتجاجوں اور مطالبوں ہی تک محدود نہیں ہے، بلکہ اسے پوری طرح دلائل سے مسلح کردینے کی کوششیں بھی برابر جاری ہیں۔یعنی تحریک نے مسلم پرسنل لا کے پورے مسئلے پر بالعموم اور اس کے ان اجزا پر بالخصوص،جن کو آجکل جارحانہ تنقید واعتراض کا نشانہ بنالیا گیا ہے اور بڑی سختی سے قابل رد ٹھہرایا جارہا ہے،ٹھوس علمی کتابیں تیار کرانے کا پروگرام بنارکھا ہے۔جن کا مدعا ایک طرف تو حکومت کے ذہن میں اس حقیقت کو تازہ کردینا ہے کہ یہ احکام بھی دین وشریعت ہی،کا حصہ ہیں اس لیے ان کی ترمیم وتنسیخ کا کوئی بھی حتی کہ خود مسلمان بھی مجاز نہیں ہے،دوسری طرف ان گہری حکمتوں اور اعلیٰ مصلحتوں کو بھی تفصیل اور دلائل کے ساتھ روشن کردینا ہے جو اسلام کے ان عائلی اور معاشرتی احکام کے اندر موجود ہیں۔تاکہ واضح ہوجائے کہ انسان کی بھلائی ان احکام کے بدل دینے میں نہیں، بلکہ ان پر صحیح طور سے عمل کرنے میں ہے (اس سلسلے کی بعض کتابیں تیار ہوکر چھپ بھی چکی ہیں۔جیسے تعدد ازدواج ،حقوق الزوجین ، پردہ ،عورت اسلامی معاشرے میں اور بعض زیر ترتیب ہیں)

● ''مسلمانوں میں دینی بیداری'' پیدا کرنے کا جہاں تک تعلق ہے اس کے لیے تو کہنا چاہیے کہ تحریک کی پوری مشنیری ہی سرگرم عمل ہے اور مسلسل سرگرم عمل ہے۔اس کے عام اجتماعات جو مقامی، ضلعی ،حلقہ وار اور مرکزی سطح پر پورے ملک میں برابر منعقد ہوا کرتے ہیں،

اس کا وسیع لٹریچر جو گوشے گوشے تک پہنچا ہوا ہے اور برابر پہنچتا جا رہا ہے، اس کے اخبار اور رسائل جو خاصی بڑی تعداد میں اور مختلف زبانوں میں شائع ہو رہے ہیں اور اس کی دعوتی جدو جہد جو اس کے کارکنوں کا روزمرہ کا وظیفہ حیات ہے، سب کا ایک اہم ترین مقصد اور مدعا ہی یہی ہے کہ مسلمانوں کے اندر اپنے دین کا علم پیدا ہو، وہ جان جائیں کہ اسلام کیا ہے اور ان سے کیا چاہتا ہے؟ ان کا دینی شعور بیدار اور ایمانی احساس زندہ رہے۔ یہاں تک کہ ان کی زندگی وہ زندگی بن جائے جو رضائے الٰہی کی زندگی ہوتی ہے۔ واضح طور پر یہی وہ صورت حال ہے جسے صحیح معنوں میں دینی بیداری کہا جا سکتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ مسلمانوں میں دینی بیداری پیدا کرنے کا کام اسی پیمانے پر ہو رہا ہے جس پیمانے پر کہ تحریک کا دعوتی کام ہو رہا ہے۔ پھر ابتدائی دینی تعلیم کی توسیع کا پروگرام بھی اپنی حد تک اس جدو جہد کے حق میں ایک اچھے معاون کا کام ثابت ہو رہا ہے۔

● ''خدمت خلق'' کے جو کام تحریک اسلامی اجتماعی حیثیت سے اور منظم طریقے پر انجام دیا کرتی ہے، اس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو مستقل کاموں کی ہے اور دوسری قسم ہنگامی کاموں کی۔ مستقل نوعیت کے کارِ خدمت تو وہ ہیں جنھیں تمام مقامی جماعتیں اپنی اپنی بستیوں کے ضرورت مندوں کی مدد اور حاجت روائی کے سلسلے میں اپنے مقدور بھر برابر انجام دیا کرتی ہیں، اور یہ کام ان کی ذمہ داریوں میں سے ایک لازمی اور دستوری ذمہ داری ہے۔ ہنگامی نوعیت کی خدمت کے کام وہ ہیں جو صرف ایسے مواقع پر انجام دیے جاتے ہیں جب ملت پر یا ملک پر کوئی بڑی اور غیر معمولی قسم کی افتاد پڑ جاتی ہے۔ یہ کام حسب حالات وسیع پیمانوں پر انجام دیے جاتے ہیں اور ان کے سلسلے میں مہمیں بھی چلائی جاتی ہیں۔ چنانچہ اب تک تحریک ایسی متعدد خدمات انجام دے چکی ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۴۸ء میں حیدر آباد کے پولیس ایکشن میں برباد ہونے والوں کی ۱۹۶۱ء میں جبل پور اور ساگر کے اور ۱۹۶۴ء میں راوڑ کیلا، جمشید پور اور دوسرے مقامات کے تباہ حالوں کی، نیز ۱۹۶۵ء میں ملک کے سیلاب زدوں کی اور ۶۶۔۱۹۶۷ء کے قحط میں بہار اور مشرقی یوپی کے آفت رسیدوں کی، اسی طرح ۱۹۶۷ء میں فلسطین کے خانماں بربادوں کی اور اب ۱۹۶۹ء میں گجرات کے مظلوموں کی امداد اور بحالی کے لیے اس نے جو سرگرمیاں دکھائی ہیں اور اللہ کے بندوں کی جیسی کچھ خدمات انجام دی ہیں، انھیں اس کی طاقت کے اعتبار سے عظیم ہی

کہا جاسکتا ہے۔ رہیں ان سے کم درجے کی خدمات، جو محدود علاقوں میں اور نسبتاً کم بڑے حادثوں کے مواقع پر انجام دی گئیں، تو ان کی فہرست کافی طویل ہے۔

● ''فرقہ پرستی اور قومی کش مکش'' کی روک تھام تحریک کے عملی پروگراموں کا ہمیشہ ہی سے ایک اہم جزو رہی ہے۔ اس غرض سے یہ باشندگان ملک کو بالعموم اور مسلمانوں کو بالخصوص دلائل وشواہد سے یہ سمجھانے کی کوشش کرتی رہتی ہے کہ یہ چیز تمہارے لیے کسی حال میں بھی ایک خطرناک زہر سے کم نہیں ہے۔ یہ تمہارے دین وایمان کے لیے بھی آفت ہے اور تمہاری دنیا کے لیے بھی موت کا سامان ہے۔ مسلمانوں کو اس کی ہلاکت آفرینیوں سے بچانے کے لیے اس نے انھیں یہاں تک تلقین کی کہ وہ اسمبلی کی سیٹوں اور سرکاری ملازمتوں میں اپنا حصہ رسدی حاصل کرنے کی فکر وسعی سے بلند ہوکر رہیں۔ کیونکہ یہ چیزیں بھی اگر قوم پرستی کے اس شجر خبیث کی شاخ نہیں تو اس کی جڑوں کی آب یاری کا ذریعہ یقیناً ہیں، جو ان کے لیے ایک مدت سے انتہائی کڑوے کسیلے پھل فراہم کررہا ہے۔ اس کے بجائے انھیں ایک اصولی جماعت کی حیثیت سے اٹھنا اور اللہ کے دین کی سچی شہادت کے مقام پر آجانا چاہیے، کہ بالآخر اسی کام میں ان کی دنیا کی فلاح بھی چھپی ہوئی ہے اور آخرت کی نجات بھی مضمر ہے۔ نیز ملک کے دوسرے باشندوں کا بھی اسی میں بھلا ہے۔ جسے وہ چاہے آج محسوس نہ کرسکیں، مگر ایک وقت ضرور آئے گا جب وہ اسے محسوس کیے بغیر نہ رہ سکیں گے، بشرطیکہ امت مسلمہ نے اس ملک میں امت مسلمہ بن کر زندگی بسر کرنے کا فیصلہ کرلیا ہو۔

● ''منکرات کا ازالہ اور معروف کا قیام'' چونکہ ایک بڑا وسیع کام ہے اور وہ برائیاں بے شمار ہیں جو ملکی معاشرے کو اپنے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں، اس لیے یہ تحریک اسلامی کے بس کی بات نہیں تھی کہ ان سب کے خلاف محاذ قائم کرلیتی۔ دانش مندی کا تقاضا یہی تھا کہ ان میں سے چند ایسی برائیوں کو منتخب کرلیتی جن کی ہلاکت سامانیاں بہت عام ہیں اور جو بجائے خود بہت سی دوسری برائیوں کا سرچشمہ بھی ہیں اور پھر ان ہی کے خلاف اپنی عملی توجہ کو صرف کرتی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا ہے۔ جن منکرات کو اس نے اس غرض کے لیے منتخب کیا ہے وہ یہ ہیں:

شراب، فحش لٹریچر اور رقص وسرود۔

ان برائیوں کے خلاف تحریک اسلامی رائے عامہ کو بیدار اور حکومت کے ذمہ داروں کو

متوجہ کرتی رہتی ہے۔اس کی یہ مسلسل کوشش ہے کہ ان چیزوں کی اخلاقی اور معاشرتی مضرتوں کو عقلی دلائل اور عملی شہادتوں کی روشنی میں بالکل عریاں کردے، تاکہ لوگوں کا ضمیر ان لعنتوں کے خلاف زیادہ سے زیادہ چبھن محسوس کرنے لگے اور وہ ان سے اپنے ملک اور معاشرے کو پاک کردینے کے لیے بے چینی سے اٹھ کھڑے ہوں۔

● ''مسلمانوں کی جان و مال کے تحفظ'' کا معاملہ کم از کم ہنگامی طور پر حد درجہ مستحق توجہ ہے۔لیکن جس طرح وہ حد درجہ مستحق توجہ ہے اسی طرح حد درجہ پیچیدہ بھی ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق ایسے عوامل سے ہے جن پر قابو حاصل کر پانا یا جنھیں متاثر کر لینا بظاہر حالات مشکل ثابت ہو رہا ہے۔ تاہم تحریک کو بہر حال اپنا فرض ادا کرنا ہے اور ایمان کا تقاضا ہے کہ یہ حالات سے ذرا بھی مایوس نہ ہو، بلکہ یقین رکھے کہ ایک نہ ایک دن یہ بحرانی صورت حال ختم ہو کر رہے گی۔ البتہ یہ ضرور ہے کہ اس کے لیے مناسب کوششیں اور تدبیریں عمل میں لائی جائیں۔ اس سلسلے میں تحریک اسلامی کی اختیار کی ہوئی تدبیریں اور کوششیں حسب ذیل ہیں۔

(۱) جارحانہ حملوں اور فرقہ پرستانہ فسادوں کے دور رس مہلک نتائج سے یہ باشندگان ملک کو باخبر کر رہی ہے اور صحیح حالات وحقائق سے ان کی اس بے خبری کو دور کرنے کے لیے کوشاں رہتی ہے جو اس فرقہ وارانہ بربریت کے خوفناک انجام سے انھیں غافل اور بے پروا بنائے ہوئے ہے۔

(۲) اکثریت کے امن پسند افراد کو ملک کے شر پسند اور فسادی عناصر کے خلاف صف آرا ہونے کا ملکی، قومی، انسانی اور اخلاقی فرض ادا کرنے پر ابھارتی رہتی ہے۔

(۳) اس سلسلے میں حکومت اور اس کے ایڈمنسٹریشن پر جو بنیادی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں اور جن کی طرف سے وہ اکثر و بیشتر تکلیف دہ حد تک کوتاہی کا ثبوت دیتی رہتی ہے، ان کے بارے میں اسے مؤثر انداز میں توجہ دلاتی رہتی ہے۔

(۴) ان غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان افواہوں کی تردید کیا کرتی ہے جو عام طور سے یا ہنگامی طور پر، مسلمانوں اور غیر مسلموں کے باہمی تعلقات کو متاثر کر دیا کرتی ہیں اور بسا اوقات فساد اور قتل و غارت کا سبب بن جایا کرتی ہیں۔

(۵) مسلمانوں کو یہ تلقین کرتی رہتی ہے کہ حملوں کے وقت گھبراہٹ، پست ہمتی

اور بے بسی کا ہرگز شکار نہ ہوں، بلکہ صورت حال کا جرأت اور پامردی سے مقابلہ کریں، اپنی حفاظت اور اپنے دفاع کے لیے وہ تمام تدبیریں اختیار کریں جو نہ شرعاً اور اخلاقاً غلط ہیں اور نہ مروجہ قانون کے خلاف ہیں اور اس سلسلے میں سماج کے دوسرے امن دوست اور حق پسند عناصر کا تعاون بھی حاصل کریں۔

(۶) سب سے آخری اور سب سے بنیادی بات یہ ہے کہ وہ مسلمانوں کو ایمانی استقامت، اسلامی اخلاق اور قرآنی تعلق باللہ اور توکل علی اللہ کی صفات پیدا کرنے کی تلقین کرتی رہتی ہے اور انھیں یہ حقیقت سمجھاتی رہتی ہے کہ ان پر پڑنے والی یہ ساری افتاد دراصل نتیجہ ہے صرف اس بات کا کہ وہ اپنے دین اور اپنے اللہ سے دور ہو گئے ہیں، اس لیے اس کا بنیادی اور حقیقی علاج بھی صرف یہ ہے کہ وہ اپنے دین کے قریب اور اپنے اللہ کی پناہ میں آ جائیں۔

(۲) دوسرے مسائل

وہ ملی اور ملکی مسائل، جو نسبتاً کم اہمیت کے حامل ہیں اور جن کے بارے میں تحریک اسلامی نے مختلف وجوہ کی بنا پر، اپنی توجہ کو صرف اظہار جذبات وخیالات ہی تک محدود رکھا ہے، درج ذیل قسموں کے ہیں:

(۱) فرد کی آزادی سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

ان مسائل میں عقیدے، رائے، ضمیر، اظہار خیال، تبلیغ افکار اور اجتماع کی آزادی، بنیادی انسانی حقوق کا تحفظ، جمہوری قدروں کی بقا وترقی اور ہر طرح کے آمرانہ رجحانات اور کلیت پسندانہ اقدامات کی روک تھام کے امور شامل ہیں۔

(۲) سماجی انصاف سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

ان مسائل میں معاشرتی اونچ نیچ اور چھوت چھات کی بیخ کنی، نسل پرستی، طبقہ واریت اور لسانی تعصب کا انسداد اور اردو زبان کی حمایت وغیرہ امور شامل ہیں۔

(۳) تعمیر اخلاق سے تعلق رکھنے والے مسائل۔

ان مسائل سے مراد عریانی، فحاشی، عصمت فروشی، رشوت، جوا، چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی جیسی عام برائیوں کی اصلاح ہے۔

(۴) بیرون ملک کے وہ مسائل جن کی کوئی نمایاں دینی یا انسانی اہمیت ہو۔

مثلاً عالمی امن وامان، افراد اور اقوام کے بنیادی انسانی حقوق، اسلامی اخوت کے ناگزیر تقاضے اور عام انسانی ہمدردی کے مقتضیات وغیرہ۔

ان تمام مسائل کے بارے میں ''اظہار جذبات وخیالات'' کا مطلب یہ ہے کہ ان کے سلسلے میں امر حق کی صاف صاف اور بالکل بے لاگ طریقے سے وضاحت کی جائے گی، سچائی اور انصاف کے پہلو کی تائید کی جائے گی، اور ظلم وزیادتی کی مخالفت اور مذمت کی جائے گی۔

تحریک اسلامی اور مسائل ملک وملت کا عملی حل

سوال کیا جاسکتا ہے کہ تحریک اسلامی اپنی اس وقت کی اور آیندہ کی کوششوں سے ملک و ملت کے ان مسائل کو فی الواقع کس حد تک حل کر سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے ہمیں پہلے یہ جاننا ہوگا کہ کسی ملت یا کسی ملک کے مسائل کب حل ہوا کرتے ہیں؟ اور وہ کون سے بنیادی عوامل ہیں جن پر یہ حل موقوف ہوا کرتا ہے؟ اس کے بعد ہی مسائل ملک وملت کے عملی حل کے سلسلے میں تحریک اسلامی کا موقف سمجھ میں آسکے گا۔

مسائل کب حل ہوا کرتے ہیں؟

کسی ملک یا قوم کے مسائل کا صحیح اور واقعی حل، واضح طور پر تین چیزوں پر موقوف ہوا کرتا ہے:

۱۔ معاشرے کی، خصوصاً اس کے سربراہ طبقے کی اصول پسندی، اخلاقی بلندی اور حق پرستی۔

۲۔ سیاسی اقتدار۔

۳۔ صالح اور عادلانہ قوانین۔

ان تینوں چیزوں میں اہمیت کے اعتبار سے فرق ضرور ہے، لیکن ضروری اور ناگزیر ان میں سے ہر چیز ہے: اصول پسندی اور حق پرستی کی اہمیت اس بارے میں اولین مقام رکھتی ہے۔ کسی انسانی گروہ کے پاس اس بیش بہا دولت کا ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ اسے اپنے مسائل کے کامیاب حل کی بنیادی ضمانت حاصل ہے۔ یہاں تک کہ باقی دونوں ہی چیزوں ——— سیاسی اقتدار اور صحیح قوانین ——— سے محروم ہوتے ہوئے بھی وہ محض اسی ایک طاقت کے ذریعے اپنی زندگی کی کتنی ہی دشواریوں پر قابو حاصل کر سکتا ہے اور اس کے کتنے ہی مسائل کا یک گونہ حل نکل

آ سکتا ہے۔اسی طرح اگر اس کے پاس زندگی کا یہ حقیقی سہارا موجود نہیں ہے تو اس کی زندگی مسائل کی الجھنوں اور دشواریوں کی خارزار بنی رہنے سے کبھی محفوظ نہیں رہ سکتی۔ سیاسی اقتدار اور بہتر قوانین بھی اس کے درد کا درماں نہیں بن سکتے۔

سیاسی اقتدار کا جہاں تک تعلق ہے، اس کی ضرورت واہمیت تو معروف ومسلّم ہی ہے۔ کسی بھی قوم کی زندگی، پوری کی پوری، اسی اقتدار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ وہی اس کے لیے قوانین بناتا ہے۔ وہی اس پر ان قوانین کا نفاذ کرتا ہے، وہی اس کے لیے فکر وعمل کی راہیں متعین کرتا ہے۔ وہی اپنے حسب منشا تعلیم کا نظام بناتا اور اس کے ذریعہ قوم کی نئی نسلوں کے ذہن ڈھالتا ہے اور اب تو وہی صحیح وغلط، خوب وناخوب اور حق وباطل کے فیصلے بھی کرنے لگا ہے۔ اس لیے اگر کسی قوم کے پاس یہ اقتدار موجود نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے مسائل کے حل کی ایک اہم شاہ کلید سے محروم ہے، جس کے باعث وہ ان کے واقعی حل کے لیے کوئی کامیاب اقدام کر ہی نہیں سکتی۔

صالح اور عادلانہ قوانین کی ضرورت اور اہمیت بھی کچھ ڈھکی چھپی نہیں ہے۔ ملکی آئین و قانون میں اگر بے اعتدالی اور فساد ہو تو معاشرے میں سلجھاؤ، ہمواری اور ہم آہنگی پیدا کی ہی نہیں جاسکتی اور اس کا طرح طرح کی پیچیدگیوں اور خرابیوں کا شکار بن کر رہ جانا بالکل یقینی ہو جاتا ہے۔ کہیں فرد کی آزادی سلب ہو جاتی ہے اور اس کی شخصیت جماعت کے شکنجے میں بھنچ کر رہ جاتی ہے، تو کہیں جماعت کو بے دست و پا بنا کر رکھ دیا جاتا ہے اور اس کے مقابلے میں افراد کو بے لگام بنا دیا جاتا ہے۔ کہیں مادیت ہی مادیت کا سکہ چلتا رہتا ہے اور دین واخلاق کی قدریں دم توڑ جاتی ہیں، تو کہیں مادی تقاضوں کو ناقابل اعتنا ٹھہرا دیا جاتا ہے اور کہیں فرد کی آزادی کو اتنا محترم بنا دیا جاتا ہے کہ کھلی ہوئی برائیوں اور بدترین فواحش پر بھی کوئی قدغن باقی نہیں رہ جاتی، تو کہیں اسے اتنا بے وقعت قرار دے دیا جاتا ہے کہ وہ اپنے ضمیر اور عقیدے کے تقاضے اپنی نجی زندگی میں بھی پورے نہیں کرسکتا۔ دنیا کے اطراف وجوانب پر نگاہ دوڑا کر دیکھیے تو یہ تمام ہی صورتیں آپ کو واقعے کی شکل میں موجود ملیں گی۔ ظاہر ہے کہ اس طرح کی کوئی بھی صورت حال انسانیت کے لیے خیر و فلاح کا اور کسی انسانی معاشرے کے لیے عدل وسکون کا موجب نہ کبھی بنی ہے اور نہ کبھی بن سکتی ہے۔ اس سے زندگی کے مسائل حل کیا ہوں گے، یہ تو آئے دن خود نئے نئے مسائل پیدا کرتی

کرتی رہے گی۔ اس لیے ایک ایسا ماحول نصیب ہونے کے لیے جس میں انسانیت کو اضطراب اور کشاکش سے اور انسانی معاشرے کو عذاب جاں بننے والے مسائل سے امان حاصل ہو، صالح اور عادلانہ قوانین کا نفاذ بھی از حد ضروری ہے۔

تحریکی دور میں مسائل کے عملی حل سے معذوری

ان تینوں چیزوں میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جو تحریکوں کے پاس موجود ہوتی ہو۔ کامیابی کی منزل تک پہنچ جانے سے پہلے وہ نہ تو سیاسی اقتدار کی مالک ہوا کرتی ہیں، نہ ملک کے لیے آئین وقانون بنانے کی پوزیشن رکھتی ہیں اور کم وبیش یہی حال تیسری چیز ــــــ معاشرے کی اصول پسندی اور حق پرستی کا بھی ــــــ ہوا کرتا ہے ــــــ یہ اس لیے کہ کسی معاشرے میں اگر کوئی تحریک اٹھتی ہے تو اس کی دو ہی نوعیتیں ہوسکتی ہیں: یا تو وہ دین واخلاق سے کوئی تعلق نہ رکھنے والی تحریک ہوگی یا پھر ان کی علمبردار تحریک ہوگی۔ اگر صورت واقعہ پہلی ہو تو کم از کم اس کی نسبت سے معاشرے میں اخلاقی اور دینی اقدار کی زندگی اور فروغ کا کوئی سوال ہی نہیں رہ جاتا اور اگر صورت واقعہ دوسری ہو تو یہ خود اس بات کی دلیل ہوگی کہ معاشرہ اصول پسندی، اخلاقی بلندی اور حق پرستی کے جوہر سے بڑی حد تک خالی ہو چکا ہے۔ کیونکہ اس کے اندر ایک علمبردار دین واخلاق تحریک کا اٹھنا معنی ہی یہ رکھتا ہے کہ وہاں دین واخلاق کی نبضیں یا تو ڈوبنے ہی لگی تھیں، یا کم از کم اتنی ناتواں ضرور ہو چکی تھیں کہ زندگی کے دھارے پر ان کا کوئی قابل لحاظ اثر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ حل مسائل کے ان لازمی ذرائع سے محروم ہونے کے باوجود ہر انقلابی اور ہمہ گیر تحریک انھیں، یا ان میں سے جنھیں وہ ضروری سمجھتی ہو ان کے حاصل کرنے کی تگ ودو میں برابر مصروف رہا کرتی ہے۔ لیکن جب تک اس تگ ودو کی منزلِ کامیابی نہیں آجاتی، اس وقت تک نہ صرف یہ کہ یہ چیزیں اسے حاصل نہیں ہوتیں، بلکہ بالعموم اس کی مخالفت ہی میں استعمال ہورہی ہوتی ہیں۔ جب حقیقت واقعہ یہ ہے تو کوئی بھی تحریک نہ ملک وملت کے مسائل کو بالفعل حل کرسکتی ہے، نہ اس سے اس طرح کی کوئی توقع قائم کرنا حق بجانب ہوسکتا ہے۔ جب اسے وہ اسباب وذرائع میسر ہی نہیں ہوتے جن پر مسائل کا حل موقوف ہوا کرتا ہے، تو آخر وہ اس طرح کی کوئی کارکردگی کیسے دکھا سکتی ہے؟ یہ کارکردگی تو وہ اسی وقت دکھا سکتی ہے جب اجتماعی

زندگی کا نظم ونسق اس کے ہاتھ میں آچکا ہو۔ اس سے پہلے وہ اپنی تمام تر خوبیوں اور صلاحیتوں کے باوجود اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کرسکتی کہ اپنی مدلل تنقیدوں کے ذریعہ وقت کے حکمراں نظام سے رائے عامہ کو بیزار اور اس کے خلاف صف آرا بنا دے، یا پھر کسی حد تک یہ بھی کہ اس پر عوامی دباؤ ڈال کر اسے بعض ایسے اقدامات کے لیے مجبور کردیا کرے جنھیں وہ پسندیدہ سمجھ رہی ہو اور لوگوں کو اس کی اچھائی اور ضرورت کا قائل بنا چکی ہو۔ یہ بالکل نہیں ہوسکتا کہ وہ ملک اور معاشرے کے الجھے ہوئے مسائل کو خود حل کردے۔ ان مسائل کو حل کردینا تو دور رہا، کچھ بعید نہیں کہ اس کی جدوجہد کے نتیجے میں کتنے ہی مسائل کی پیچیدگیاں اور اذیت ناکیاں اور بڑھ جائیں۔ اشتراکی تحریک کی بالکل تازہ اور نمایاں مثال دنیا کے سامنے موجود ہے۔ وہ محنت کش عوام کے مسائل، اپنے خیال اور دعوے کے مطابق بھی، اسی وقت حل کرسکنے کی پوزیشن میں ہوسکی جب ایک طویل مدت کی صبر آزما جدوجہد کے بعد زار شاہی کا تختہ الٹ کر خود بااقتدار بن گئی۔ اس سے پہلے ان محنت کشوں کو دینے کے لیے اس کے پاس کوئی چیز نہیں تھی۔ اگر تھی تو زندگی کی مزید پریشانی، مسائل کی مزید ہیبت ناکی اور دار و رسن کی مصیبت ہی تھی۔ جہاں تک اسلامی تحریکوں اور انبیائی دعوتوں کا تعلق ہے، کہنا چاہیے کہ ان کی تو پوری تاریخ کا ایک ایک صفحہ اس حقیقت کی مکمل شہادت ہے۔

غرض تحریکیں مسائل حل نہیں کیا کرتیں، بلکہ وہ مسائل کے حل کے لیے ہوا کرتی ہیں۔

ایک خاص اور محدود استثناء

اس عام کلیے سے بعض تحریکیں ایک خاص معنی میں مستثنیٰ بھی ہوا کرتی ہیں۔ گو یہ استثناء بہت ہی محدود قسم کا ہوا کرتا ہے۔ لیکن ہوتا ہے بہر حال۔ یہ وہ تحریکیں ہوتی ہیں جن کی بنیاد مکمل طور سے دین اور اخلاق پر ہوتی ہے اور جو افراد کی تربیت، معاشرے کی تعمیر اور اجتماعی نظام کی تشکیل خدائی احکام و ہدایات کے مطابق کرنا چاہتی ہیں اور اپنے اس نصب العین کے عین مطابق ہی طریق کار بھی اختیار کیے ہوئے ہوتی ہیں۔ یہ استثنا اس لیے ہوتا ہے کہ یہ تحریکیں بھی اگرچہ دوسری تحریکوں کی ہی طرح نہ سیاسی اقتدار رکھتی ہیں اور نہ اپنے حسب منشا صالح اور عادلانہ قوانین کے نفاذ کی پوزیشن میں ہوتی ہیں، لیکن جہاں تک تیسری چیز ـــــ معاشرے کی اخلاقی پاکیزگی، اصول پسندی اور حق پرستی ـــــ کا تعلق ہے، اس کی حد تک ان کا معاملہ

دوسری تحریکوں سے بنیادی طور پر مختلف ہوتا ہے۔ دوسری تحریکیں جہاں اس چیز کو کوئی خاص اہمیت بالکل نہیں دیتیں، وہاں یہی شے ان تحریکوں کا اولین مرکز توجہ بنی رہتی ہے اور ان کا کوئی بھی مرحلہ ایسا نہیں ہوتا جس میں ان کی نگاہوں سے یہ متاع مطلوب ذرا بھی اوجھل رہتی ہو۔ کیونکہ ان کے سامنے جو اعلیٰ مقاصد ہوتے ہیں، ان کے حاصل ہو سکنے کے لیے صرف سیاسی اقتدار اور بہتر قوانین ہی کافی نہیں ہوتے، بلکہ افراد معاشرہ کی ذہنی اور اخلاقی پاکیزگی اور عملی صالحیت بھی ضروری ہوتی ہے اور بدرجہ اولیٰ ضروری ہوتی ہے۔ اس لیے لوگوں کی فکری تطہیر اور اخلاقی تربیت کا کام قدرتی طور پر ان کی عملی سرگرمیوں کا سب سے اہم نشانہ ہوا کرتا ہے، جس کے نتیجے میں معاشرے کے اندر اخلاق وحق پرستی کی طاقت پہلے دن سے ابھرنے لگتی ہے اور پھر مسلسل ترقی کرتی رہتی ہے۔ اب چونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ کسی ملک اور قوم کا اخلاقی زوال ہی دراصل اس کے لیے پیچیدہ اور پریشان کن مسائل پیدا کرنے کا سب سے بڑا سبب ہوا کرتا ہے، اس لیے اگر کوئی تحریک اس زوال کو دور کر رہی ہو اور ملک میں اخلاق وحق پسندی کو فروغ دے رہی ہو تو یہ کہنا کسی طرح خلاف واقعہ نہ ہوگا کہ وہ اس کے مسائل کو، کسی نہ کسی حد تک بہر حال، اس دوران بھی حل کر رہی ہے۔ بالخصوص ان افرادِ قوم کے سلسلے میں تو اس امر واقعی کو بالکل نمایاں طور پر محسوس کر لیا جا سکتا ہے جو اس تحریک سے وابستہ ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کے دل ودماغ پر اس کے اعلیٰ تصورات اور بلند اخلاقی مطالبات کا قدرتی طور پر گہرا اثر ہوتا ہے۔ اس لیے ان کے لیے وہ بہت سے مسائل، مسائل ہی نہیں رہ جاتے جو پست نظری، خودغرضی اور اخلاقی بے حسی ہی کی پیداوار بھی ہوتے ہیں اور انہی گندگیوں کے اندر زندہ بھی رہ سکتے ہیں۔

تحریک اسلامی کا امتیاز

تحریک اسلامی چونکہ ایک ایسی ہی تحریک ہے اور اس کی بنیاد بھی تمام تر دین واخلاق اور خدا پرستی ہی پر رکھی گئی ہے، اس لیے کوئی شبہ نہیں کہ وہ بھی انہی ''مستثنیٰ تحریکوں'' میں سے ایک ہے۔ یعنی وہ بھی ایک ایسی ہی دعوت وتحریک ہے جو اقتدار واختیار کی منزل تک پہنچے بغیر ہی حتیٰ کہ اپنے کام کے آغاز کے ساتھ ہی ملک وملت کے مسائل کے حل پر خوش گوار اثر ڈال سکتی ہے اور اپنے دائرہ عمل واثر کی حد تک واقعۃً ڈال بھی رہی ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ یہاں مسائل کا

ایک ناپیدا کنار جنگل اگا ہوا ہے۔ جس کے اندر اس محدود اثر کو ظاہر بیں نگاہیں محسوس نہ کرسکیں، مگر گہرائی تک پہنچنے والی نگاہیں بھی اسے محسوس نہ کرسکیں، ایسا نہیں ہوسکتا۔

ملک اور ملت کے مسائل کے حل پر تحریک اسلامی کا یہ ''خوش گوار اثر'' کیوں کر، کس طرح اور کس حد تک پڑ رہا ہے یا پڑ سکتا ہے، ان باتوں کو اگر کچھ وضاحت سے سمجھنا ہو تو ضروری ہے کہ پہلے ان بحثوں کو ذہن میں پھر سے تازہ کرلیا جائے جو اس تحریک کے نصب العین، اس کے طریق کار اور اس کے اپنے ارکان کی تربیت کے بارے میں اوپر گزر چکی ہیں۔ اس سے اس بات کا خود اندازہ ہو جائے گا کہ اس دعوت کے فروغ کے کیا معنی ہیں؟ اور اس کے پیغام کی مقبولیت معاشرے کے اندر، زیر سطح کس قسم کی تبدیلیاں لا رہی ہوگی؟ جس دعوت کا خمیر تمام تر دین و خدا پرستی سے اٹھایا گیا ہو اور جس تحریک کا مقصد خلق خدا کو سچا حق پرست اور آخرت پسند بنانا ہو، کوئی شک نہیں کہ اس کے زیر اثر آتے رہنے والے افراد بہت کچھ مختلف قسم کے انسان ہوں گے۔ جس نفسانیت، خود غرضی، حق تلفی اور مفاد پرستی میں دنیا آج غرق ہے، ان سے ان کا ضمیر بالیقین کراہت محسوس کرے گا۔ معاملات میں ان کی روش اخلاق و دیانت کی ہوگی۔ مسائل کے بارے میں فیصلے کا انحصار ان کے نزدیک حق اور انصاف پر ہوگا۔ گروہی، نسلی، قومی اور طبقاتی عصبیتوں سے ان کے دل و دماغ پاک ہوں گے۔ راستی اور حق پسندی، ہمدردی اور بھائی چارہ، محنت اور فرض شناسی اور سادگی اور قناعت ان کی زندگی کے رہنما اصول ہوں گے۔ ظاہر بات ہے کہ معاشرے میں ایسے افراد جس تناسب سے بڑھتے جائیں گے اسی تناسب سے فکر و عمل کی یہ صالحیت بھی عام ہوتی جائے گی اور یہاں زندگی کے انفرادی و اجتماعی سبھی دائروں میں اس کے عملی اثرات زیادہ سے زیادہ محسوس ہونے لگیں گے، جس کے نتیجے میں مسائل کے حل پر کسی نہ کسی معنی میں اور کسی نہ کسی حد تک خوش گوار اثر کا پڑنا بالکل فطری بات ہے۔ خصوصاً ان افراد معاشرہ کی حد تک یہ اثر کافی نمایاں بھی ہوگا اور کافی پائیدار بھی جو اس دعوت سے سچے شعور اور اخلاص کے ساتھ وابستہ ہو چکے ہوں اور ان کے لیے مسائل کی الجھنیں اتنی اور ایسی ہرگز نہ رہ جائیں گی جتنی اور جیسی دوسروں کو محسوس ہو رہی ہیں۔ مثال کے طور پر آج عام لوگوں کے لیے معاش کا مسئلہ جتنی غیر معمولی اہمیت اختیار کرگیا ہے اور اس کی فکر جس طرح ان کے اعصاب پر ہر وقت سوار رہا کرتی ہے، اس کا مظاہرہ ان افراد کے قول و فعل سے ہرگز نہ ہوگا۔ یہ اس لیے کہ معاشی ضرورت کا جو

تصور اور اقتصادی خوش حالی کا جو معیار مطلوب دوسروں کا ہے، ان کا نہ ہوگا نہ ہو سکے گا۔ وہ تو لاکھوں کا بینک بیلنس رکھتے ہوئے بھی ذہنی طور پر محتاج ہی ہوتے اور مزید دولت کی تونس سے ہر دم بے قرار ہی رہتے ہیں، جب کہ یہ اشخاص معمولی طرز کی موٹی جھوٹی زندگی پر بھی یا زیادہ سے زیادہ ایک اوسط درجے کی زندگی پر قانع ہوں گے۔ اسی طرح محنت اور سرمائے کی کش مکش اس وقت ہر جگہ ایک انتہائی پیچیدہ اور ہنگامہ خیز مسئلہ بنی ہوئی ہے، مگر تحریک اسلامی کے پیدا کیے ہوئے ماحول میں اس کی حیثیت ایک معمولی مسئلے سے زیادہ شاید ہی کچھ رہ جائے۔ کیونکہ نہ یہاں کا سرمایہ دار وہ سرمایہ دار رہے گا جو کم سے کم پیسوں میں مزدور کا زیادہ سے زیادہ خون چوس لینے کی تدبیریں سوچتا ہے، نہ یہاں کا مزدور وہ مزدور ہوگا جو محنت سے دور بھاگتا ہے، احساس فرض سے ناآشنا ہوتا ہے اور دن رات صرف اپنے حقوق کے لیے لڑتا رہتا ہے۔ ان ہی دو مثالوں پر اور مسائل کو بھی قیاس کر لیجیے۔ جس قدر زیادہ مسائل کو لے کر غور کیا جائے گا اسی قدر یہ حقیقت روشن سے روشن تر ہوتی جائے گی کہ اس تحریک سے وابستگی رکھنے والے افراد خواہ وہ کسان یا مزدور، تاجر یا صنعت کار، طالب علم یا معلم، ملازم یا آقا، ماتحت یا افسر، عوام یا خواص، غرض کسی بھی شعبہ حیات سے تعلق رکھنے والے ہوں، خود اپنے لیے بھی اور اپنے معاشرے اور ملک کے لیے بھی، بہت کچھ ایک مختلف قسم کے انسان ہوں گے، جنھیں ان لوگوں پر ہرگز قیاس نہیں کیا جاسکتا جو آئے دن مسائل پیدا کرنا ہی جانتے ہیں حل کرنا بالکل نہیں جانتے، جو زندگی کے معاملات میں اخلاقی تقاضوں سے بالعموم بیگانہ بنے رہتے ہیں، جنھیں حقوق سے تو عشق ہوتا ہے لیکن ذمہ داریوں کے نام سے بھی انقباض ہوتا ہے۔ ان کے برخلاف ان کا رویہ اپنے حقوق کے تحفظ کا ہوگا تو ساتھ ہی اپنے فرائض کی دیانت دارانہ انجام دہی کا بھی ہوگا اور سبھی معاملات میں حق وانصاف کے اصول اور امن وآشتی کے تقاضے ان کے رہنما ہوں گے۔ ایسے افراد کا وجود کیسے ممکن ہے کہ ملک وملت کے مسائل پر خوش گوار اثر نہ ڈالے؟

ہاں یہ ضرور ہے کہ ''مسائل پر پڑنے والے اس خوش گوار اثر'' کو چونکہ اس پیمانے سے بمشکل ہی ناپا جاسکتا ہے جس سے ناپنے کا آجکل کا ذہن عادی ہے، اس لیے عام لوگوں کے لیے اسے محسوس کر لینا آسان نہ ہوگا لیکن ٹھوس اور ثابت شدہ حقیقتیں اس بات کی ہرگز محتاج نہیں ہوا کرتیں کہ سطح بیں لوگ بھی ان کا ادراک اور اعتراف کر لیں۔ ایسے لوگ بددیانتی اور رشوت کے

انسداد کے لیے ''محکمۂ انسدادرشوت ستانی'' کے قیام کواور مجرموں کے لیے سخت قوانین کے نفاذ کوتو مسئلے کا حل کہیں گے، لیکن افراد معاشرہ کے اندر خدا کا خوف اور آخرت کی باز پرس کا احساس پیدا کردینے کو، جس کے نتیجہ میں وہ ان برائیوں سے خود باز آجایا کریں، مسئلے کا کوئی حل سمجھنے سے بالکل قاصر ہوں گے۔ وہ سرکاری تجارت کوتو چور بازاری اور ذخیرہ اندوزی کے روکنے کا بڑا کارگر نسخہ قرار دیں گے، لیکن اس سیرت سازی کو کوئی اہمیت نہ دے سکیں گے جو انسان کو نری کاروباری ذہنیت سے اونچا اٹھادے اور اسے قلت، گرانی اور فاقے کی مصیبت میں خلق خدا کو مبتلا کردینے والی سنگدلانہ حرکتوں اور تدبیروں سے ازخود روک دیا کرے۔ اسی طرح وہ بھاری قسم کی بھاری بھرکم تعلیمی اسکیموں کوتو جہالت کی تاریکیاں دور کرنے والا چشمہ نور باور کریں گے، لیکن افرادانسانی کے سینوں میں انسانیت کا شعور اور خداپرستانہ اخلاق کی حس بیدار کردینے کی جدوجہد ان کے نزدیک کسی قدر وقیمت کی مستحق نہ ہوگی۔ غرض زندگی کے جس مسئلے کو بھی لے لیجیے، اس کے حل کے لیے آج کل سارا انحصار صرف قانونی الٹ پھیر اور انتظامی احتساب ہی پر رہ گیا ہے اور محض اسی طرح کی تدبیروں کو مسائل کا حل سمجھا جارہا ہے۔ لیکن عقل اور تجربہ دونوں کا فیصلہ کل بھی یہی رہا ہے، آج بھی یہی ہے اور آیندہ بھی یہی رہے گا کہ مسائل کے حل میں اگرچہ آئین وقانون اور انتظامی تدبیروں کی اہمیت مسلم ہے، مگر یہ اہمیت بہرحال ثانوی درجے ہی کی ہے، بنیادی اہمیت اور ضرورت جس چیز کی ہے وہ انسانی ذہن کی صالحیت اور سیرت کی پاکیزگی ہے۔ جب تک یہ چیز موجود نہ ہو، مسائل کو سلجھانے کی کوئی تدبیر کامیاب نہیں ہوسکتی اور انسانی ذہن کی یہی صالحیت اور سیرت کی یہی پاکیزگی وہ شے ہے جسے پیدا کرنے کے لیے تحریک اسلامی کا پورا نظام سرگرم عمل ہے۔

تحریک اسلامی اور ملی اتحاد

تحریکی نظامِ جماعت کی حیثیت

چونکہ یہ دعوت کسی نئے دین کی تاسیس کی نہیں، بلکہ احیاء دین کی دعوت ہے اور یہ ایک ایسی ملت کی موجودگی میں اور اس کے اندر سے اٹھی ہے جو اپنی اصل حیثیت کے اعتبار سے خود اسی کے علمبرداروں اور پیرووں پر مشتمل ہے، اس لیے اس کی اور اس کے جماعتی نظام کی حیثیت انبیائی دعوتوں اور ان کے جماعتی نظاموں کی حیثیت سے بنیادی طور پر مختلف ہے، جس کے وجوہ انبیائی دعوتوں کی درج ذیل خصوصیتیں ہیں:

۱۔ انبیائی دعوتوں کے اندر حق مرکوز ہوا کرتا تھا۔ یعنی ان کے باہر حق کا کوئی وجود نہیں ہوتا تھا، وہاں جو کچھ ہوتا تھا وہ سرتا سر باطل ہی باطل ہوتا تھا۔

۲۔ ان دعوتوں کے سربراہ انبیاء علیہم السلام مکمل طور پر مرکز حق و معیار حق ہوا کرتے تھے۔ ہر ایک کے لیے ان کی کامل اور غیر مشروط پیروی ضروری ہوا کرتی تھی اور کسی بھی شخص کا برسرحق اور ہدایت یافتہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی رحمت و مغفرت کا سزاوار ٹھہرنا انہی کے اتباع پر موقوف ہوا کرتا تھا۔

۳۔ ان دعوتوں کو قبول کر لینے والوں سے جو ہیئت اجتماعیہ ـــــ امت یا ملت ـــــ وجود میں آتی تھی وہ ''الجماعۃ'' ہوتی تھی۔ الجماعۃ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس طرح ان دعوتوں کے اندر حق مرکوز ہوا کرتا اور ان کے دائرے سے باہر رہنے والا حق سے لازماً محروم رہا کرتا تھا اور جس طرح ان دعوتوں کے علمبردار انبیاء علیہم السلام مرکز حق ہوا کرتے تھے اور ہدایت یابی

کے لیے ان کی پیروی ضروری ہوا کرتی تھی، اسی طرح اس ہیئت اجتماعیہ میں شامل ہونا اور اس کا جز و ترکیبی بن جانا بھی ضروری ہوا کرتا تھا اور جو کوئی اس سے الگ رہتا اس کا شمار بھی اہل حق میں سے نہیں ہوتا تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس جماعت سے باہر حق اور ہدایت کا کوئی وجود قابل تسلیم نہیں ہوا کرتا تھا۔

۴۔ ان دعوتوں کے علمبردار، انبیاء علیہم السلام، کو اللہ کا سچا پیام بر اور داعی حق تسلیم کرنا اور ان کی اطاعت کرنا ہی کافی نہیں ہوا کرتا تھا، بلکہ ان کے سچے قائم مقاموں کی سربراہی کو تسلیم کرنا اور ان کی اطاعت کرنا بھی ضروری ہوا کرتا تھا۔ یہ سچے قائم مقام، جن کو اسلام کی زبان میں خلیفۂ راشد، یا امیر المومنین، کہا جاتا ہے، ہر ایک کے لیے واجب الاطاعت ہوا کرتے تھے اور ان کی خلافت یا اطاعت سے انکار، حق سے بغاوت کے ہم معنی ہوا کرتا تھا۔

۵۔ جس طرح انبیاء علیہم السلام اور ان کے ساتھی اہل ایمان کی جماعت 'الجماعۃ' ہوا کرتی تھی اسی طرح ان دعوتوں سے وابستہ بعد کے اہل ایمان کی ہیئت اجتماعیہ بھی 'الجماعۃ' ہی ہوا کرتی تھی اور کسی شخص کے برسرِحق ہونے کے لیے اس سے تنظیمی وابستگی بھی ضروری قرار پایا کرتی تھی۔ اس سے علیحدگی اختیار کرنا اپنے آپ کو اہل حق کے زمرے سے علیحدہ کر دینا ہوا کرتا تھا۔ اہل ایمان کی اجتماعی ہیئتوں کی یہی پوزیشن بعد میں بھی اس وقت تک برابر قائم رہتی جب تک کہ وہ واقعی معنوں میں اجتماعی ہیئتیں رہتیں اور دینی زوال ان کے حبل اللٰہی شیرازہ کو درہم برہم نہ کر دیتا۔

انبیائی دعوتوں کی ان پانچوں خصوصیتوں سے ظاہر ہے کہ، دوسری تمام دینی دعوتیں اور تحریکیں یکسر محروم ہوا کرتی ہیں۔ یہ تحریک اسلامی بھی چونکہ ایسی ہی ایک دینی تحریک ہے، اس لیے قدرتی طور پر وہ بھی ان میں سے کسی خصوصیت کی حامل نہیں سمجھی جاسکتی اور نہ وہ خود ایسا سمجھتی ہے۔ وہ اس ادعا اور گمان سے کوسوں دور ہے کہ حق اسی کے اندر دائر اور مرکوز ہے، یا اس کی اجتماعی تنظیم 'الجماعۃ' ہے یا اس کا سربراہ اور امیر خلیفۂ راشد اور امیر المومنین کی حیثیت رکھتا ہے۔ اسے اس حقیقت کا پورا علم اور شعور ہے کہ دینی زوال اور ملی انتشار کے اس فتنوں بھرے دور میں وہ دین اور ملت کے کھوئے ہوئے مقام کی بازیافت کی ایک اور صرف ایک کوشش ہے اور اس طرح کوششیں دوسری بھی بہت سی ہوسکتی ہیں اور اخلاص و راست فکری سے اگر کام لیا گیا ہو تو یہ ساری کی ساری کوششیں یکساں برحق بھی ہوں گی۔ اس لیے ملت کے جو افراد اس کے ساتھ نہیں ہیں، بلکہ جو اس

سے اختلاف بھی رکھتے ہیں، محض اس علیٰحدگی اور اختلاف کی بنا پر وہ اس کے نزدیک کسی ملامت یا شکایت کے سزاوار ہرگز نہیں ہیں۔ ہاں اسے اس بات پر ضرور اصرار ہے کہ اس کے نصب العین ''اقامت دین'' کے بارے میں کسی اختلاف کی ہرگز کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس نصب العین کی مخالفت انسان کو حق سے قطعی طور پر محروم کردے گی۔ اس لیے جہاں لوگوں کو اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ وہ اس تحریک کے مخصوص نظم سے الگ رہیں اور دیانت داری کے ساتھ اس سے اختلاف کریں، وہیں ان پر یہ ذمہ داری بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اس نصب العین کو بہر حال اپنا مقصد حیات قرار دیں اور جس طریقے کو وہ صحیح اسلامی اور انبیائی طریقہ سمجھتے ہوں اسی کے مطابق اللہ کے دین کی اقامت کے لیے جدوجہد کرتے رہیں۔

'تحریک اسلامی' نے اپنی اور اپنے جماعتی نظم کی حیثیت کے بارے میں اس اہم حقیقت کا اظہار بھی نہایت واضح لفظوں میں کر رکھا ہے اور پہلے دن سے کر رکھا ہے۔ چنانچہ اگست ۱۹۴۱ء ہی میں جب کہ اس کا باضابطہ قیام عمل میں آرہا تھا، منتخب ہونے والے امیر جماعت نے لوگوں کو پوری تاکید کے ساتھ یہ بات ذہن نشیں کرادی تھی کہ:

> ''خوب سمجھ لیجیے کہ ہماری حیثیت بعینہٖ اس جماعت کی سی نہیں ہے جو ابتداءً نبی کی قیادت میں بنتی ہے۔ بلکہ ہماری صحیح حیثیت اس جماعت کی ہے جو اصل نظام جماعت کے درہم برہم ہو جانے کے بعد اس کو تازہ کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ نبی کی قیادت میں جو جماعت بنتی ہے وہ تمام دنیا میں ایک ہی اسلامی جماعت ہوتی ہے اور اس کے دائرے سے باہر صرف کفر ہی ہوتا ہے، مگر بعد میں اس نظام اور کام کو تازہ کرنے کے لیے جو لوگ اٹھیں، ضروری نہیں کہ ان سب کی بھی ایک ہی جماعت ہو۔ ایسی جماعتیں بیک وقت بہت سی ہوسکتی ہیں اور ان میں سے کسی کو بھی یہ کہنے کا حق نہیں ہے کہ بس ہم ہی اسلامی جماعت ہیں اور ہمارا امیر ہی امیر المومنین ہے اس معاملہ میں تمام ان لوگوں کو جو ہماری جماعت میں شامل ہوں، غلو سے سخت پرہیز کرنا چاہیے۔ کیونکہ بہر حال ہم کو مسلمانوں میں ایک فرقہ بننا نہیں ہے۔ خدا ہمیں اس سے بچائے کہ ہم اس کے دین کے لیے کچھ کام کرنے کے بجائے مزید خرابیاں پیدا کرنے کے موجب بن جائیں۔''　(روداد اجتماع اول، ص: ۷، ۸ مطبوعہ ۲۰۰۱)

اسی طرح اس کے جماعتی سربراہ کی حیثیت کے بارے میں خود اس کے دستور میں یہ صراحت روزِ اول سے موجود چلی آرہی ہے کہ:

"جماعت اسلامی ہند کا ایک امیر ہوگا جس کی حیثیت "امیر المؤمنین" باصطلاح معروف کی نہ ہوگی۔ بلکہ صرف اس جماعت کے رہنما کی ہوگی...... جماعت کی دعوت اپنے امیر کی شخصیت یا امارت کی طرف نہ ہوگی" (ص: ۱۸)

فقہی وسعت نظر

چونکہ اسلام صرف عقائد اور کچھ اصولی احکام دین ہی کا نام نہیں ہے، بلکہ شریعت کے تفصیلی احکام بھی اس کے لازمی اجزاء ہیں، اس لیے پورے دین کی اقامت کی علمبردار تحریک ہونے کے باعث اس تحریک کے لیے جزئی سے جزئی احکام شریعت بھی دل وجان سے عزیز ہیں، اور ان کی پیروی کو بھی وہ بالکل ضروری سمجھتی ہے اور انسانی زندگی پر انھیں پورے اہتمام سے نافذ العمل دیکھنا چاہتی ہے۔ لیکن ان احکام میں سے بیشتر کی حیثیت چونکہ اجتہادی ہے اور باقی کی بھی حیثیت منصوص ہونے کے باوجود ایسی ہے کہ خود شریعت نے ان میں سے کتنوں ہی کے اندر وسعت دے رکھی ہے، اس لیے ان کے بارے میں اہل فکر ونظر کا اختلاف بالکل فطری بات ہے۔ اس اختلاف کو نہ دین کا اختلاف سمجھا جاسکتا ہے، نہ اس کی بنا پر حق وناحق کی بحث اٹھائی جاسکتی ہے، بلکہ ہر رائے اور مسلک یکساں طور پر برحق اور قابل اتباع ہوگا اور ہر ایک کے بارے میں یہی تصور کیا جانا چاہیے کہ اسے منشائے شریعت کی، اپنی فہم وفکر کی حد تک، صحیح ترجمانی سمجھ کر ہی اختیار کیا گیا ہے۔ فقہی مسائل کے بارے میں یہی نقطۂ نظر صحیح اور مزاج شرع کے مطابق ہے اور تحریک اسلامی اسی نقطۂ نظر کو اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ اس معاملے میں کسی تنگ نظری اور مسلکی تشدد کو بالکل صحیح نہیں سمجھ سکتی۔ چنانچہ وہ ہر مسلک کے پیرووں کو اپنے دائرے میں یکساں طور پر جگہ دیتی ہے۔ حنفی اور شافعی، مالکی اور حنبلی، اہل حدیث اور اہل تقلید، سب اس کے رکن بن سکتے ہیں اور بنتے رہتے ہیں۔ اس کے ارکان کو صرف اسی بات کی آزادی نہیں ہے کہ وہ اپنے اپنے پسندیدہ فقہی مسلک پر عمل کریں، بلکہ انہیں اس بات کا بھی حق حاصل ہے کہ دلائل کے ذریعہ وہ اپنے مسلک کی سنجیدہ انداز میں، مدافعت اور حمایت بھی کرسکتے ہیں۔ البتہ کسی کو یہ اجازت نہیں ہے کہ وہ ان فقہی اختلافات کو حق وباطل کا اختلاف قرار دے دے اور ان کے سلسلے میں اس طرح

کے مناظرے اور مجادلے کرے جن کا افسوسناک مظاہرہ ہمارے یہاں آئے دن ہوتا رہا ہے اور جن کا حاصل اگر کچھ نکلا تو صرف یہ نکلا کہ ایک طرف تو جسدملّی پارہ پارہ ہوتا گیا، دوسری طرف دین کی حقیقی روح اور اس کے اعلیٰ مقاصد پس پشت پڑتے چلے گئے اور شریعت کی جزئیات اور مظاہر ہی گویا اصل دین قرار پا گئے۔ ظاہر ہے کہ یہ تباہ کن کج فکری کسی طرح بھی گوارا کیے جانے کے لائق نہیں ہوسکتی۔ اس لیے تحریک اسلامی نے بالکل بجا طور پر اس بنیادی حقیقت کو دانتوں سے پکڑے رہنا ضروری سمجھا کہ اصول کو اصول کا اور فروع کو فروع کا درجہ صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ عمل سے بھی دیا جائے۔ دین کے اصول و مقاصد اور شریعت کے تفصیلی احکام میں اہمیتوں کا جو فرق ہے وہ ذہنوں میں بھی اچھی طرح بیٹھا ہوا ہو، اسلام اور قرآن کی پیروی کا حق ادا کرنے کا سوال ہو یا ان کی اشاعت اور دعوت و تلقین کا اولین اور بنیادی توجہ ان کے اساسی مطالبات ہی پر دی جائے، اور اگر چہ کسی جزئی سے جزئی حکم شریعت کی بھی بجا آوری میں کوتاہی نہ برتی جائے، لیکن جہاں تک اختلافی مسائل کا تعلق ہے ان میں توسع اور رواداری کا ملحوظ رکھنا بہر حال ضروری ہے۔

'تحریک اسلامی' اگر اپنے ارکان کو یہ اصولی ہدایت نہ دیتی تو بھی توقع اسی بات کی تھی کہ وہ از خود اسی روش پر چلتے۔ کیونکہ جس بلند اور ہمہ گیر نصب العین کو وہ اپنائے ہوئے ہیں وہ قدرتی طور پر انسان کا ذہن ہی اسی طرح کا بنا دینے والا ہے۔ انسان غلط مشاغل یا معمولی باتوں میں دلچسپی لیتا ہی اس وقت ہے جب اسے کوئی صحیح یا بڑا کام مصروف رکھے ہوئے نہیں ہوتا۔ ملت اسلامیہ فقہی مناظروں اور کلامی مجادلوں میں اتنی تندہی سے الجھی ہی اس وجہ سے کہ حق کی شہادت اور دین کی اقامت کا بلند مقصد اس کی نگاہوں سے بالعموم اوجھل ہو کر رہ گیا تھا۔ ورنہ اس کا ذہن اس طرح کے مشغلوں کی کبھی سوچ ہی نہیں سکتا تھا۔ اس لیے جن لوگوں کے سامنے یہ مقصد اپنی اصل اہمیت کے ساتھ آ جائے گا انھیں جزئی اختلافی مسائل کی معرکہ آرائیاں اور فضول بحثیں اپنی طرف مائل کر ہی نہیں سکتیں۔ فکر و عمل کا حقیقی ہدف مہیا ہو جانے کے بعد نہ ان کے پاس ایسے مشاغل کے لیے وقت ہوگا، نہ ان کے اندر وہ کوئی افادیت محسوس کریں گے۔ اس لیے وہ ان کے قریب بھی نہ جائیں گے۔ چنانچہ یہ ایک ناقابل انکار واقعیت ہے کہ تحریک اسلامی کے حلقوں میں فقہی اختلافات کبھی بحث و مجادلہ، گروہ بندی، انتشار اور کشیدگی کا سبب نہیں بنتے اور اس سے

وابستہ افراد کے اندر ایک دوسرے کے فقہی مسلک کو نہ صرف برداشت کرنے کا، بلکہ اس کے احترام کا جذبہ کارفرما رہتا ہے۔

فرقہ ساز نہیں، باعثِ اتحاد دعوت

جب کوئی نئی تحریک اٹھتی ہے تو کبھی ناواقفیت کی بنا پر اور کبھی دوسرے محرکات کے تحت، طرح طرح کے اندیشوں اور خطرات کا اظہار بھی اس کے خلاف ضرور کیا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ انبیائی دعوتیں بھی اس صورت حال سے محفوظ نہیں رہ سکتیں جو سراپا خیر اور مطلقاً حق وصداقت ہی ہوا کرتی تھیں اور جن کے قول وفعل میں کہیں بھی کوئی داغ دھبہ دکھائی نہیں دیا کرتا تھا۔ پھر یہ توقع کیسے کی جاسکتی ہے کہ اس تحریک کے بارے میں بے سروپا اندیشوں اور خطرات کا اظہار نہ کیا جائے گا؟ چنانچہ وہ شروع ہی سے رنگارنگ الزاموں کی زد میں ہے۔ ان الزاموں میں ایک بڑا ہی عجیب وغریب الزام یہ ہے کہ یہ تحریک انتشار کی ماری ہوئی ملت کے جسم میں ایک اور شگاف ڈال رہی ہے، اتنا ہی نہیں بلکہ یہ بھی کہ یہ ایک نئے فرقے کو جنم دے رہی ہے۔ لیکن اس الزام کی حقیقت کیا ہے، اسے معلوم کرنے کے لیے مذکورہ بالا حقائق اور تفصیلات پر ایک نظر ڈال لینا بالکل کافی ہوگا۔ جس تحریک کی حیثیت انبیائی دعوتوں کے پرتو کی ہو اور جو انہی کے نقوش قدم کو اپنے لیے دلیل راہ بنائے ہوئے ہو، جس کا نصب العین حق کی شہادت اور پورے دین کی اقامت ہو، جو امت مسلمہ کو اس کا بھولا ہوا فرض منصبی یاد دلا رہی ہو، جو بکھری ہوئی ملت کو حبل اللہ کے شیرازے میں پھر سے پرو دینا چاہتی ہو، جو شریعت کے تفصیلی احکام اور فقہی اختلافات کے سلسلے میں وسعت نظر اور باہمی احترام کو اپنا شعار بنائے ہوئے ہو، جو اپنے بارے میں کبھی برخود غلط نہ ہوئی ہو، یعنی نہ اپنے کو کبھی انبیائی دعوتوں کا مثیل قرار دیا ہو، نہ اپنے اندر کبھی حق کو دائر گمان کیا ہو، نہ اپنے جماعتی نظام کو الجماعۃ خیال کیا ہو، نہ اپنے سربراہ (امیر جماعت) کو اصطلاحی، امیر المؤمنین، سمجھنے یا کہنے کی غلطی کی ہو، بلکہ ان میں سے ہر شے کے بارے میں اس کی صحیح حیثیت کا واضح لفظوں میں اعلان کر رکھا ہو۔ ایسی تحریک کے متعلق یہ سوچنا بھی بڑا سخت ظلم ہوگا کہ وہ امت میں کسی نئے فرقے کے وجود میں آنے یا کسی اختلاف وانتشار کا سبب بن سکتی ہے۔ یہ دعوت کسی شخصیت کی طرف نہیں، کسی جماعت کی طرف نہیں، کسی نئے عقیدے کی طرف نہیں، کسی خودساختہ

نصب العین کی طرف نہیں اور کسی خاص فقہی مسلک کی طرف نہیں، پھر وہ کسی نئے فرقے کی بانی ہوسکتی ہے تو کیسے؟ یا امت میں کسی افتراق کا سبب بن سکتی ہے تو آخر کس طرح؟ فرقہ سازی یا ملی انتشار کے جو بھی اسباب ہوا کرتے ہیں اور ہوتے رہتے ہیں، ان میں سے جب کوئی بھی یہاں موجود نہیں ہے تو پھر آپ سے آپ یہ فتنے کس طرح ظہور میں آسکتے ہیں؟ کیا 'علت' کے بغیر بھی کوئی معلول آج تک صورت وجود اختیار کرسکا ہے؟ تحریک اسلامی کے اصول وافکار اور اس کے ''قول وفعل'' کے بارے میں جو حقائق اتنی مدلل وضاحت اور تفصیل کے ساتھ اوپر سامنے لائے جاچکے ہیں، ان کی موجودگی میں بھی اگر یہ ملت میں مزید انتشار پیدا کرنے اور ایک نئے فرقے کے جنم دینے کا موجب بن سکتی ہے تو کہنا چاہیے کہ اب تریاق ہلاک کیا کرے گا اور حیاتین سے بھرپور غذائیں جسموں کو گھلا دیا کریں گی! تحریک کا نصب العین' اس کے بنیادی نکات، اس کے اصول کار، اس کے افکار، اس کی عملی سرگرمیاں اور اس کا فقہی نقطۂ نظر تو وہ چیزیں ہیں جو امت کے موجودہ افتراق کو بھی ختم کردینے والی اور مسلم فرقوں کے درمیان کی خلیج کو پاٹ دینے والی ہیں۔ چنانچہ واقعات شہادت دے رہے ہیں کہ جہاں تک اس کی آواز اثر کرتی جارہی ہے یہ افتراق مٹتا جارہا اور یہ خلیج پٹتی جارہی ہے۔ اس لیے اس پر فرقہ سازی یا انتشار آفرینی کا الزام عائد کرنا بہت بڑا ظلم ہے۔ حقیقت واقعی تو یہ ہے کہ یہ دعوت اقامت دین اتحاد ملت کی بھی دعوت ہے۔ بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اتحاد ملت کی حقیقی شاہراہ اس کے سوا اور کوئی ہے ہی نہیں جو اس دعوت کی راہ ہے۔ البتہ اس حقیقت کو سمجھ پانے کے لیے ضروری ہے کہ ذہن میں مطلق اتحاد کا تصور نہ ہو، بلکہ اس اتحاد کا تصور ہو جس کا امت مسلمہ کو حکم دیا گیا ہے، جبل اللہ جس کا شیرازہ ہے، 'تقویٰ اور اسلام' (طاعت خداوندی) جس کی اساس ہے 'دعوت الی الخیر' اور امر بالمعروف ونہی عن المنکر، جس کا مقصد ومطلوب ہے، اور جس کے نتیجہ میں امت صرف نام کی ہی نہیں بلکہ واقعی معنوں میں امت مسلمہ اور خیر امت ہوتی ہے۔[1]

---

[1] قرآن اور اسلام کا مطلوبہ اتحاد کیا ہے اور کیسا ہے؟ اس کی تفصیل معلوم کرنے کے لیے 'اسلام اور اجتماعیت' کا مطالعہ کیجیے۔

نقشۂ کار

اسوۂ انبیا کی مکمل پیروی

تحریک اسلامی کا تفصیلی تعارف مکمل نہ ہوگا جب تک یہ بھی وضاحت سے نہ معلوم ہو جائے کہ یہ تحریک اس سرزمین میں اور ملک وملت کے موجودہ حالات میں اپنی منزل تک کس طرح پہنچنا چاہتی ہے؟ اس کا نقشۂ کار کیا ہے اور کیوں ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے اگرچہ اب تک کے مباحث کے اندر کافی رہنمائی موجود ہے، لیکن اس مسئلے کی اہمیت چاہتی ہے کہ اس پر براہ راست اور مستقل طور پر بحث کی جائے، تاکہ تحریک کے کام کا نقشہ بیک وقت، پورے کا پورا، نظر کے سامنے آجائے۔

اپنا نقشۂ کار، تحریک اگرچہ غور وفکر اور قیاس اور اندازے سے بھی کام لے کر بنا سکتی تھی۔ اس لیے کہ اس کا نصب العین بڑی حد تک خود بتا دیتا ہے کہ اس کے کام کا نقشہ کیا ہونا چاہیے۔ لیکن قیاس بہر حال قیاس ہی ہوتا ہے، جس کے فیصلے پوری طرح قابل اطمینان کبھی نہیں ہو سکتے۔ دوسری طرف دینی دعوتوں اور اسلامی تحریکوں کی ایک طویل تاریخ کی موجودگی میں نظری انداز سے کام لینے کی کوئی ضرورت بھی نہیں تھی۔ ان دعوتوں کی سرگزشت یہ بتانے کے لیے بالکل کافی بھی تھی اور اطمینان بخش بھی، کہ آج کی اس دعوت اسلامی کو کون سا نقشۂ کار اختیار کرنا چاہیے۔ اس سرگزشت میں اس بات کی پوری وضاحت بھی موجود ہے کہ ان دعوتوں اور دینی تحریکوں کے کام کے بنیادی خطوط کیا رہے ہیں اور جب بھی وہ منزل مقصود کو پہنچی ہیں تو، کس طرح اور کن مرحلوں سے گزر کر پہنچی ہیں۔ یہ وضاحت جہاں گزشتہ دینی تحریکوں کے نقشہ ہائے کار کی

وضاحت ہے، وہیں اس حقیقت کا اظہار بھی ہے کہ آیندہ کی بھی دینی دعوتوں کے لیے یہی نقشے حقیقی مشعلِ راہ ہوں گے۔ عقل کا یہ کھلا ہوا تقاضا ہے کہ ایک ہی نوعیت کا نصب العین رکھنے والی اصولی تحریکوں کے نقشہ ہائے کار بھی بنیادی طور پر ایک ہی نوعیت کے ہوں گے۔ ماحول اور زمانہ کا اختلاف ان کے درمیان تفصیلات کا فرق تو ضرور پیدا کرسکتا ہے، مگر کوئی اصولی اور بنیادی فرق ہرگز نہیں پیدا کرسکتا۔ چنانچہ تاریخ کی شہادت بھی یہی ہے کہ ماضی میں ملّی اور نظریاتی موقف رکھنے والے گروہوں کے اندر جتنی بھی دینی تحریکیں اٹھی ہیں، ان سب کے کام کے نقشے، سینکڑوں اور ہزاروں برس کے بُعد اور حالات کے فرق واختلاف کے باوجود ہمیشہ یکساں ہی رہے ہیں، جو اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ آیندہ بھی ویسے ہی رہیں گے۔ گزشتہ ادوار کی ان دینی دعوتوں میں سے سب سے زیادہ کامل اور معیاری دعوتیں وہ تھیں جن کے سربراہ حضرات انبیاء علیہم السلام تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سب سے زیادہ صحیح، کامل اور معیاری نقشہ ہائے کار بھی صرف انہی کے تھے۔ اس لیے تحریک اسلامی نے اپنے کام کا نقشہ بناتے وقت بجا طور پر انہی کو سامنے رکھا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا کرنا اس کے لیے صرف مناسب ہی نہیں، بلکہ ضروری بھی تھا۔

انبیائی دعوتوں کی قسمیں

انبیائی دعوتوں کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ نصب العین اور اصول ومقاصد اگرچہ سبھی انبیاء کے بالکل ایک تھے، لیکن ان کے مخاطب چونکہ بالکل ایک ہی جیسے نہ تھے اس لیے ان کی دعوتیں بھی ہر جہت سے بالکل ایک ہی نوعیت کی نہ تھی، بلکہ وہ چار مختلف قسموں کی تھیں:

۱۔ وہ دعوتیں، جن کا مخاطب گروہ انسانی، پورے کا پورا کافر ومشرک اور وحی ورسالت سے یکسر ناآشنا یا ان کا منکر تھا۔ بیشتر انبیائی دعوتیں اسی زمرہ میں آتی ہیں۔ مثلاً حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ابراہیمؑ، حضرت لوطؑ اور حضرت شعیب علیہم السلام وغیرہ کی دعوتیں۔

۲۔ وہ دعوتیں، جن کا مخاطب گروہ انسانی تمام تر صرف ایسے لوگوں پر مشتمل تھا جو پہلے سے کسی آسمانی کتاب کے ماننے والے اور کسی سابق پیغمبر کے امتی تھے اور اس وجہ سے توحید آخرت، وحی ونبوت اور دین وشریعت کسی چیز کا بھی تصور ان کے لیے بالکل نیا اور یکسر اجنبی نہیں

تھا، بلکہ وہ ان تمام باتوں سے فی الجملہ واقف بھی تھے اور ان پر ایمان رکھنے کے دعوے دار بھی تھے۔ البتہ ان کی عملی زندگی خیر وتقویٰ سے قریب قریب بالکل خالی ہوکر رہ گئی تھی اور ان کے عقائد میں بھی بڑی زبردست قسم کی خرابیاں پیدا ہوچکی تھیں۔ ان دعوتوں میں حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت زکریا، حضرت یحیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام وغیرہ کی دعوتیں شامل ہیں۔

۳۔ وہ دعوتیں، جن کے مخاطب دونوں ہی قسم کے لوگ تھے، اہل کفر وشرک بھی اور کتاب ورسالت کے جاننے اور ماننے والے بھی۔ مگر ان دونوں قسم کے لوگوں کی حیثیتوں میں ایک فرق بھی تھا۔ دوسری قسم کے لوگوں کی طرف ان دعوتوں کے علم بردار انبیاء کی بعثت اصلاً تھی اور وہ ان کے اصل مخاطب تھے، جب کہ پہلی قسم کے لوگوں کی طرف ان کی بعثت ضمناً تھی۔ مثلاً حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام، جو مبعوث تو اصلاً بنی اسرائیل کی طرف ہوئے تھے، لیکن بعض مخصوص حالات ووجوہ کی بنا پر شاہانِ مصر اور ان کے اہل قوم بھی ان کے دائرۂ خطاب میں داخل تھے۔

۴۔ وہ دعوت، جس کے مخاطب بھی اہل شرک وکفر اور کتاب ورسالت کے جاننے اور ماننے والے ـــــ اہل کتاب ـــــ دونوں ہی قسم کے لوگ تھے، مگر اس طور پر کہ اس کے علمبردار نبی کی بعثت اصلاً ان میں سے کسی ایک ہی گروہ کی طرف نہیں بلکہ دونوں ہی کی طرف ہوئی تھی اور کسی کی طرف بھی ضمناً نہیں تھی۔ فرق اگر تھا تو صرف اس بات کا تھا کہ پہلی قسم کے لوگ ـــــ بلکہ ان میں سے بھی صرف ایک خاص گروہ کے افراد ـــــ اس کے اولین مخاطب تھے اور باقی سب لوگ بعد کے مخاطب تھے۔ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس ایک خاص گروہ کی طرف یہ بعثت براہ راست تھی اور باقی تمام لوگوں کی طرف بڑی حد تک اس گروہ کے توسط سے تھی۔ اس قسم کی دعوت نبی آخرالزماں ﷺ کی دعوت تھی۔ آپؐ اہل شرک وکفر اور اہل کتاب، دونوں ہی قسم کے لوگوں کی طرف مبعوث ہوئے تھے اور دونوں ہی آپ کے اصل مخاطب تھے۔ البتہ عملی صورت واقعہ یہ تھی کہ پہلی قسم کے لوگوں میں کے ایک گروہ 'گروہ قوم عرب' کی طرف آپ کا خطاب اولین اور براہ راست تھا اور باقی تمام اہل شرک وکفر اور سارے اہل کتاب کی طرف بعد میں اور بالعموم انہی عربوں کے واسطے سے تھا۔

انبیائی دعوتوں کے نقشہ ہائے کار

ان مختلف اقسام کی دعوتوں کے علمبردار انبیاء نے اپنے اپنے دائرۂ خطاب کے اندر کام کے جو نقشے اختیار فرمائے تھے، ان کی ضروری تفصیل یہ ہے:

(۱) اہل شرک وکفر کے درمیان

سب سے پہلے ان انبیاء کے نقشۂ کار کو لیجیے جن کی بعثت تمامتر اہل شرک وکفر کے درمیان ہوئی تھی اور کوئی اہل کتاب گروہ ان کے دائرہ خطاب میں شامل نہ تھا۔ قرآن کریم نے ان انبیاء کے بنیادی خطوط کار یہ بیان کیے ہیں:

● دین کے بنیادی امور کی دعوت اصل مرکزِ توجہ

صرف دعوت کی ابتدا ہی دین کے بنیادی امور سے نہیں کی گئی ـــــ جو فطری اور بدیہی طور پر ایک ضروری بات تھی ـــــ بلکہ طویل مدت تک سارا زور بھی انہی چیزوں پر دیا جاتا رہا۔ یوں کہیے کہ پوری دعوتی جدوجہد انہی کے اردگرد گھومتی رہی۔ آگے قدم اسی وقت بڑھایا گیا جب اساسات دین کی تبلیغ اور تفہیم کا حق پورا ہو گیا اور پورے معاشرے کو اس حد تک کھنگال لیا گیا کہ اس کے اندر جتنے افراد قبول حق کی صلاحیت رکھنے والے تھے وہ دیر یا سویر اس دعوت پر ایمان لا چکے ـــ یہ بنیادی امور تین تھے:

(۱) پہلی چیز توحید تھی جو سب سے اہم بھی تھی اور دعوت کا مغز اور خلاصہ بھی۔ اس لیے قدرتی طور پر زور بھی اس پر زیادہ دیا جاتا رہا اور دعوتی سعی و جہد اور بحث و گفتگو زیادہ تر اسی پر مرکوز رہا کرتی تھی۔ خدا کے پیغمبر اس کے بندوں کو یہ سمجھانے کی پیہم کوشش کرتے رہتے تھے کہ جس طرح تمہارا، اس دنیا کا اور پوری کائنات کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے ـــ جیسا کہ تم خود مانتے ہو ـــ اسی طرح سب کا مدبر و منتظم، رازق و پروردگار، مالک و فرمانروا، معبود و مسجود بھی صرف وہی ہے اور صرف وہی ہو سکتا ہے۔ پس بندگی اسی کی کرو، ولی و کارساز اسی کو سمجھو، نفع اور نقصان پہنچانے والا اسی کو مانو، خوف اور تقویٰ اسی کا رکھو، پرستش اسی کی کرو، دعائیں اسی سے مانگو، اطاعت اسی کے احکام کی کرو، رضا اسی کی چاہو۔ اس کے سوا ہر ایک کی پرستش اور اطاعت سرتاسر

جہل ہے، ظلم ہے، باطل ہے ضلالت ہے۔اس لیے ہر طرف سے کٹ کر اپنے آپ کو اسی کی بندگی اور محکومی میں دے دو۔ یہی حق ہے اور اسی لیے تم پیدا کیے گئے ہو۔

(۲) دوسری چیز آخرت تھی۔ ہر پیغمبر توحید پر ایمان لانے کی دعوت کے ساتھ ہی لوگوں کو یہ حقیقت بھی ذہن نشیں کراتا رہا کہ انسان کی یہ دنیوی زندگی ہی اس کی کل زندگی نہیں ہے، بلکہ اس چند روزہ زندگی کے بعد اسے ایک دوسری زندگی بھی ملنے والی ہے، جو کبھی ختم نہ ہوگی۔ ایک دن آئے گا جب تمھیں دوبارہ زندہ کیا جائے گا اور پھر تم سب اپنے خدا کے سامنے پیش ہوگے۔ وہ تم سے پوچھے گا کہ دنیا میں تم نے میرے احکام کی کہاں تک پیروی کی تھی؟ میں نے تمھیں جس غرض کے لیے پیدا کیا تھا اسے تم نے یاد رکھنے اور اسے پورا کرنے کا اہتمام کیا تھا یا نہیں؟ اس محاسبے کے لیے ہر شخص کا پورا عملی ریکارڈ، جو اللہ کے حکم سے برابر محفوظ کیا جاتا رہتا ہے، اس کے سامنے رکھ دیا جائے گا اور وہ کسی حرف کا بھی انکار نہ کر سکے گا۔ پھر جس شخص کے بارے میں یہ ثابت ہوگا کہ اس نے دنیا میں اللہ کی بندگی کی اور ایمان وعمل صالح کی زندگی بسر کی تھی، اسے غیر معمولی نعمتوں سے بھری ہوئی جنت کی ابدی و اخروی زندگی عطا کی جائے گی اور جس کا اعمال نامہ اللہ تعالیٰ کی بندگی کے نقوش سے خالی ہوگا، اسے جہنم کے ناقابل تصور مصائب سے بھری ہوئی ہمیشہ کی زندگی نصیب ہوگی۔ پس آج ہی کی زندگی میں کھو کر نہ رہ جاؤ، بلکہ کل کی کبھی نہ ختم ہونے والی زندگی کی فکر کرو اور اس کی کامیابی کے لیے کام کرو، جسے تم اپنے پروردگار کے حکموں پر عمل کر کے ہی حاصل کر سکتے ہو۔

(۳) تیسری چیز ان انبیاءؑ کی اپنی نبوت تھی۔ انھوں نے توحید اور آخرت ہی کی طرح اپنی نبوت اور اپنے اوپر نازل ہونے والی ہدایت الٰہی پر ایمان لانے کی بھی لوگوں کو شدت سے تلقین کی۔ انھیں بتایا کہ اللہ کی بندگی کا صحیح راستہ تمھیں صرف ہم سے مل سکتا ہے۔ کیونکہ کوئی انسان اپنے طور پر یہ ہرگز نہیں جان سکتا کہ اللہ تعالیٰ کے وہ احکام کیا ہیں جن کی پیروی کر کے وہ اس کی بندگی کا فریضہ بجا لا سکتا ہے۔ یہ احکام خود اللہ تعالیٰ کے بتانے ہی سے جانے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اس نے اسی کام کے لیے منتخب اور مقرر فرمایا ہے۔ اس نے ہمیں اپنی ہدایات اور مرضیات سے مطلع فرما کر تمھارے پاس اسی لیے بھیجا ہے تاکہ ہم تم تک انھیں پہنچا دیں۔ اس لیے ہم تمھیں جو کچھ بتا رہے ہیں، اپنی طرف سے نہیں، بلکہ اسی خدا کی طرف سے بتا رہے ہیں جس نے

تمھیں اپنی بندگی کے لیے پیدا کیا ہے اور جو کل تم سے اس کے بارے میں لازماً محاسبہ فرمائے گا۔ پس ضروری ہے کہ ہم پر ایمان لاؤ، ہماری پیغمبری کو تسلیم کرو، ہماری تعلیمات کو خدائی تعلیم باور کرو، اور ہماری اطاعت کو اپنے اوپر لازم کرلو، ورنہ تمھارے لیے راہ راست کا پانا قطعی ناممکن ہے۔

● باطل کی تردید

دعوت کو پیش کرنے کے لیے صرف ایجابی طریقہ ہی نہیں اختیار کیا گیا، بلکہ منفی طریقے کو بھی اپنایا گیا اور پہلے دن سے اپنایا گیا۔ اللہ کے پیغمبروں نے جہاں یہ بتایا کہ حق کیا ہے، وہیں ساتھ ہی وہ یہ بھی واضح کرتے رہے کہ باطل کیا ہے۔ توحید وآخرت اور وحی و رسالت ہی کی انھوں نے تلقین نہیں کی، بلکہ صاف اور دوٹوک الفاظ میں یہ بھی فرماتے رہے کہ خدائی میں کسی کو شریک سمجھنا، اس کی پرستش کرنا، اسے مُطاعِ مطلق سمجھنا یا اللہ تعالیٰ کی کسی صفت کا انکار کرنا، یا کسی کو اس کی اولاد ماننا، یا اس کی ذات کا اپنے ذہن میں من مانا تصور رکھنا اور مرنے کے بعد کی زندگی کا، آخرت کا اور محاسبۂ اعمال کا یقین نہ رکھنا اور وحی و رسالت کا منکر ہونا، غرض ہر وہ عقیدہ وخیال جو اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ ہدایت کے خلاف ہو، جہل اور باطل ہے، موجب ہلاکت ہے اور دیوار پر دے مارنے کے قابل ہے۔ اس اعلان و اظہار کو انھوں نے ہمیشہ ضروری سمجھا اور اس لیے ضروری سمجھا کہ کوئی بھی نظریہ یا مسلک اس وقت تک اچھی طرح واضح ہوتا ہی نہیں جب تک کہ اس پر منفی پہلو سے بھی روشنی نہ ڈال دی گئی ہو۔

● استدلالی اور برہانی طریق دعوت

دعوتی گفتگو سرتاسر استدلالی اور برہانی ہوا کرتی تھی۔ اگرچہ توحید، آخرت اور وحی و رسالت کے عقائد بجائے خود فطری حقائق کی حیثیت رکھتے ہیں، لیکن انبیاء علیہم السلام نے مجرد ان کے پیش کردینے اور ان کے مقابل کے غلط عقائد کو باطل ٹھہرا دینے ہی پر اکتفا نہیں کرلیا، بلکہ ان میں سے ہر ایک پر مضبوط ترین عقلی، فطری اور وجدانی دلیلیں بھی دیں، انسانی ضمیر کو بیدار کرنے کی کوششیں بھی کیں اور تاریخ کی شہادتیں پیش کرکے باطل پرستی کے برے نتائج سے لوگوں کو خبردار بھی کیا۔ پھر ایسا بھی نہیں ہوا کہ یہ دلیلیں اور یہ تنبیہیں صرف ایک بار پیش کرکے خاموشی اختیار کرلی گئی ہو بلکہ انداز بدل بدل کر انھیں بار بار پیش کیا جاتا رہا۔ تاکہ بات کو دل میں اتار دینے کی جتنی تدبیریں اور کوششیں ممکن ہوں ان میں کوئی کسر نہ رہ جائے۔

● مصالحت پسندی سے مکمل گریز

تبلیغ حق کے سلسلے میں حکمت اور دانائی تو ہر وقت ملحوظ رہتی، لیکن ایسا کبھی نہیں ہوا کہ اصل پیغام حق کے بارے میں، کسی مصلحت کی بنا پر، گول مول انداز بیان اختیار کیا گیا ہو، یا اس کے کسی پہلو کو تاریکی میں رہنے دیا گیا ہو، یا لوگوں کے جذبات کی رعایت کی گئی ہو، یا ردعمل کے ناگزیر خطرات کو کوئی وزن دیا گیا ہو۔ غرض اللہ کے پیغمبروں نے اپنی دعوت کے سلسلے میں کسی مداہنت یا مصالحت کا کبھی تصور تک نہیں کیا۔ حالانکہ وقت کے باطل عقیدوں اور نظریوں کی طرف سے اس کی پیشکشیں بھی ہوتی رہیں۔ لوگوں نے بہت چاہا کہ یہ لوگ اپنی دعوت پیش کرتے وقت بات کو ہمارے دین اور ہمارے معبودوں کی تردید تک نہ پہنچائیں، تاکہ ہمارے لیے انگیز کے قابل صورتِ حال پیدا ہو جائے اور ہم انہیں ان کے حال پر چھوڑ سکیں۔ لیکن حق کے ان علمبرداروں نے مصالحت کی ان پیشکشوں کو پوری صفائی اور شدت سے رد کر دیا اور حق و باطل کی سپید و سیاہ کی روشنی و تاریکی کی، بصیرت و جہل کی اور ہدایت و گمراہی کی پرامن بقائے باہم کے لیے وہ کبھی تیار نہ ہو سکے۔ کیونکہ اس بقائے باہم کے لیے تیار ہونا دراصل حق کی موت اور باطل کی بقا کے لیے تیار ہونا تھا۔

● دعوتی کاموں کے لیے فکر و عمل کی یکسوئی

اس وقت تک، جب تک کہ ان کی دعوت اتمام حجت کے مقام تک نہیں پہنچ گئی، انھوں نے اپنی ساری فکرمندیاں، دلچسپیاں اور کوششیں دین حق کی دعوت و تلقین اور اپنے پیرووں کی تربیت و تزکیے ہی کے لیے یکسو رکھیں اور قوم یا ملک کے حتیٰ کہ خود اپنے پیرووں کے بھی کسی دوسرے مسئلے کو اپنی مستقل توجہ کا مرکز نہیں بنایا۔ حالانکہ دنیا کی ہر قوم کی طرح ان کی قومیں بھی کتنے ہی اہم ترین مسائل سے لازماً دوچار ہوا کرتی تھیں اور جہاں تک ان کے پیرووں کا تعلق ہے ان کی تو پوری زندگی ہی روح فرسا مسائل کی آماجگاہ بنی ہوتی تھی۔ لیکن ان سب کے باوجود ان کی توجہ کبھی ان مسئلوں کو اپنا ہدف نہیں بناتی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں تھی کہ ان کی نگاہ میں ان مسائل کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی تھی یا ان کے حل سے انھیں کوئی دلچسپی نہیں تھی، بلکہ یہ تھی کہ ان کی پیغمبرانہ بصیرت ان مسائل کے واقعی حل کے لیے ابھی کسی راست اقدام کو بالکل بے وقعت

اور غیر مفید یقین کرتی تھی اور ایسا اس لیے یقین کرتی تھی کہ ابھی وہ بنیاد ہی فراہم نہیں ہو چکی ہوتی تھی جس پر انسانی زندگی کے ہر مسئلہ کا صحیح حل موقوف ہوا کرتا ہے۔ ورنہ ایک ہمہ گیر اور پوری زندگی پر محیط دعوت کے علمبردار ہونے کے باعث حیات انسانی کا ہر چھوٹا بڑا مسئلہ ان کے دائرہ فکر و عمل میں لازماً داخل تھا۔ وہ بنیاد جس پر ان کے نزدیک سارے مسائل کا صحیح حل موقوف تھا، حق تعالیٰ کی صحیح معرفت تھی اور یہ اس لیے کہ انسانی زندگی کے مسائل کا سرچشمہ کہیں خارج میں نہیں، بلکہ فی الواقع انسان کے اپنے اندرون ہی میں ہوا کرتا ہے۔ یہ انسان کا اپنا قلب اور ذہن ہی ہے جو مسئلے پیدا کرتا ہے یا انھیں ختم کر سکتا ہے۔ اس قلب پر جب تک جہل، خود پرستی اور خدا فراموشی کی تاریکی چھائی رہتی ہے وہ ٹھوکروں پر ٹھوکریں ہی کھاتا رہتا ہے اور اس کی زندگی مسائل کی الجھنوں سے کبھی نجات پا ہی نہیں سکتی۔ اس لیے مسائل کے حل کی شاہ کلید صرف یہ ہے کہ انسان کو حق شناس اور خدا آگاہ بنا دیا جائے۔ اس طرح زیادہ گہرائی میں اتر کر دیکھا جائے تو انسانی زندگی کا حقیقی مسئلہ فی الواقع ایک ہی نظر آئے گا اور وہ یہ کہ اسے اپنی عابدانہ حیثیت اور اللہ تعالیٰ کی لاشریک معبودیت کا سچا ادراک حاصل ہو جائے۔ اس ایک مسئلہ کے سوا اس کا کوئی اور مسئلہ فی الواقع مسئلہ ہی نہیں ہے، بلکہ ایسے سارے کے سارے مسائل اسی اصل مسئلے کے آثار و نتائج ہوتے ہیں، جن کا قابل اطمینان حل اس وقت تک پایا ہی نہیں جا سکتا جب تک کہ یہ اصل مسئلہ نہ حل کر لیا گیا ہو۔ اس لیے بالکل ضروری تھا کہ حضرات انبیاء علیہم السلام دعوتی دور میں اپنی ساری توجہ اللہ کے بندوں کو اس کی بندگی کی دعوت دینے ہی پر مرکوز رکھتے تھے اور اس وقت تک کسی اور مسئلہ کو ہاتھ میں نہ لیتے جب تک کہ اس کا صحیح وقت نہ آ جاتا۔

● ایمان لاتے رہنے والوں کی تنظیم و تربیت

جو افراد دعوت کو قبول کرتے جاتے یہ حضرات ایک طرف تو انھیں ایک ایسی تنظیم کے شیرازے میں پروتے جاتے جو ایک جسم کے اعضاء کی طرح آپس میں پوری طرح مربوط و متحد اور ہم آہنگ ہوتی، دوسری طرف ان کی ایسی زبردست ایمانی، اخلاقی اور عملی تربیت کرتے رہتے جو انھیں صحیح معنوں میں سرخ کندن بناتی چلی جاتی۔ یہ تنظیم "ایک جسم کے اعضاء کی طرح متحد و ہم آہنگ" اس لیے ہوتی کہ اس کے تمام ارکان کی منزل مقصود بھی ایک ہی ہوتی اور راستہ بھی ایک

ہی ہوتا، وہ مقصد ونصب العین میں بھی متحد ہوتے اور افکار واعمال اور جذبات واحساسات میں بھی۔ پھر انھیں اس حقیقت کا بھی پورا شعور ہوتا کہ منظم اجتماعی عمل کے بغیر وہ دعوت کی پیروی اور اس کے اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کا حق ادا کرنے کے قابل ہرگز نہ ہوسکیں گے۔ ان دوگونہ وجوہ کی بنا پر اس تنظیم کا استحکام قدرتی طور پر معیاری اور بے نظیر ہونا ہی چاہیے تھا۔ اسی طرح پیغمبرانہ تربیت کے نتیجے میں وہ سرخ کندن اس لیے بنتے جاتے تھے کہ ایک طرف تو تربیت دینے والی شخصیتیں انتہائی معیاری اور سراپا عمل واثر ہوتی تھیں، دوسری طرف خود اس تربیت کی بنیادیں بھی نہایت مضبوط ہوتیں اور اس کا طریقہ بھی غیر معمولی حد تک مؤثر ہوتا۔ تربیت کی یہ بنیادیں، اللہ کی ذات و صفات کے زندہ شعور اور آخرت کے گہرے یقین کی تھیں اور تربیت کا یہ طریقہ موعظت حسنہ کا تھا، جو دل میں سیدھا اتر جاتا تھا۔ اللہ کے رسول اس بات کی پیہم کوشش کرتے رہتے کہ یہ بنیادیں اہل ایمان کے دلوں میں گہری اتر جائیں، ان کے شعور سے لے کر تحت الشعور تک پر اللہ کی صفات حسنہ کا تصور پوری طرح نقش ہوجائے، یہاں تک کہ ان کی نگاہوں میں اس ایک ذات کے سوا اور کسی کی طلب باقی نہ رہ جائے اور آخرت کی فکر کے سوا ہر فکر سے وہ بلند ہوجائیں۔ اس غرض کے لیے انھوں نے ان کی روش پر برابر نگاہ رکھی اور ان کے اندر اس طلب اور اس فکر کو پروان چڑھانے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔

● اہل ایمان گروہ کی تطہیر

چونکہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ دنیا کا کوئی اچھے سے اچھا گروہ بھی شیطان کی دراندازیوں سے یکسر محفوظ نہیں ہوتا، اس لیے انبیاء علیہم السلام کی تمام تر تربیتی کوششوں کے باوجود بھی یہ امکان باقی رہتا ہی تھا کہ ان پر ایمان لانے والوں کی تنظیم میں ایسے افراد گھس آئے ہوں جن کے دل میں ایمان یا تو سرے سے ناپیدا ہو یا اگر موجود ہو بھی تو زندگی کی حرارت سے ناآشنا ہو۔ پیغمبر اس اہم خطرے کو کسی طرح نظر انداز نہیں کرسکتے تھے، کیونکہ ان کے سامنے صرف نیک افراد تیار کرنا نہیں تھا، بلکہ ایسے پیروان حق اور علمبرداران حق تیار کرنا تھا جو عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں کی طرح اس کے اجتماعی دائروں کی وسیع کارزار میں بھی اللہ کی اطاعت وبندگی کا فرض انجام دے سکیں۔ کفر وجاہلیت سے پنجہ آزمائی کرکے خدا کی اس زمین کو

ان کے شر سے پاک کرسکیں اور اس کی جگہ اللہ کے دین کو غالب و نافذ کرسکیں کہ یہی ان کی بعثت کی منزل مقصود تھی۔ ظاہر ہے کہ اس عظیم مقصد کے حصول کے لیے منتشر اور غیر منظّم افراد ہی نہیں ـــــ خواہ وہ سب کے سب کتنے ہی دین دار کیوں نہ ہوتے ـــــ بلکہ ایسی جماعت بھی موجب کامیابی نہیں ہوسکتی تھی جس کے اندر خام کاروں اور منافقوں کی بھی ایک تعداد گھسی ہوئی ہوتی۔ کیونکہ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ وقت کے منظّم افکار، غالب نظام اور بااقتدار طاقت سب کو شکست دے دی جاتی اور یہ ایک ایسا کام تھا جس سے صرف ایک ایسی منظّم جماعت ہی عہدہ برآ ہوسکتی تھی جو پوری کی پوری مخلص اہل ایمان ہی پر مشتمل ہوتی اور جس کے اندر ایسے عناصر نہ موجود ہوتے جو وقت پر اس کا ساتھ چھوڑ دینے والے اور اسے اندر سے سبوتاژ کردینے والے ہوتے۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام نے اپنی دعوت پر ایمان لانے والوں کی تربیت اور ان کی تنظیم ہی کو کافی نہیں سمجھا، بلکہ اسی کے ساتھ اس تنظیم کو غلط اور جھوٹے افراد سے پاک کرتے رہنا بھی ضروری سمجھا۔ اس غرض کے لیے وہ تنظیم ـــــ اہل ایمان کی جماعت ـــــ کے فرد فرد پر گہری نظر رکھتے تھے، جو لوگ عمل کے میدان میں خصوصاً جانی اور مالی آزمائشوں کے وقت حیلے بہانے کرکے فرار کا راستہ اختیار کرکے بے نقاب ہوجاتے ان کے بارے میں پیغمبر اور ان کے سچے پیرو سمجھ لیتے کہ یہ لوگ جماعت کے اجزاء اور اس کے یگانے نہیں، بلکہ غیر اور دشمن ہیں اور پھر ان کے شر سے محفوظ رہنے کا برابر خیال رکھا جاتا۔

● دعوتی مشن میں پیروانِ دعوت کی لازمی شرکت

جو لوگ دل سے ایمان لاتے گئے، انبیاء علیہم السلام انھیں بھی اسی مشن میں لگاتے گئے جس کے وہ خود علمبردار تھے۔ اس طرح دعوت حق کا ہر پیرو اپنی طاقت اور صلاحیت کے مطابق اس کا داعی بھی بنتا گیا اور اس کی تبلیغ و اشاعت ہی اس کی بھی زندگی کا اصل فریضہ بنتی گئی۔ جو جہاں، جس گھرانے، جس ماحول اور جس بستی میں بھی ہوتا، وہیں اس دعوت کو دوسرے بندگان خدا تک پہنچانے میں لگ جاتا، یا اگر پیغمبر کی ہدایت ہوتی تو کسی دوسرے مقام پر جاکر اسی کام میں مصروف ہوجاتا۔ اس طرح ہر چہار طرف اس پیغام کی صدائیں گونج اٹھتیں۔

● ہجرت

جیسے جیسے ایمان لانے والوں کی تعداد بڑھتی اور دعوت پھیلتی جاتی، اسی قدر ماحول کی وہ کش مکش بھی، جو پہلے دن ہی سے شروع ہو چکی ہوتی تھی، شدت اختیار کرتی جاتی تھی، اور مخالفوں کا جور و ستم ساری حدیں پھاندتا چلا جاتا تھا۔ لیکن حق کے یہ داعی سب کچھ برداشت کرتے ہوئے پوری استقامت اور کامل یکسوئی کے ساتھ اپنی دعوتی سرگرمیوں میں برابر لگے رہتے، یہاں تک کہ تبلیغ و تلقین اور افہام و تفہیم کا حق ادا ہو جاتا، وعظ و نصیحت کی ساری ممکن تدبیریں انجام پا جاتیں اور حجت تمام ہو جاتی۔ جن کے دل میں قبولِ حق کی ذرا بھی صلاحیت ہوتی وہ ایمان لا چکتے اور انکار و مخالفت کے محاذ پر وہی بدبخت باقی رہ جاتے جن کے ضمیر مردہ اور قلوب مسخ ہو چکے ہوتے تھے، اور جن کے بارے میں اب اس کی کوئی توقع نہ رہ جاتی تھی کہ ان کے کان اس پیغام کے لیے کھل سکیں گے۔ دوسری طرف ان کی مخالفت بھی جنون کی شکل اختیار کر لیتی، اور وہ پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو کسی حال میں بھی برداشت کرنے کے لیے تیار نہ رہ جاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ مرحلہ آ جانے کے بعد اب مزید کوشش یا انتظار کا کوئی موقع باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ اس لیے انبیاء علیہم السلام ان سے اس وقت برأت اور قطع تعلق کا اعلان کر دیتے اور اِذنِ الٰہی کے تحت، اپنے اہلِ ایمان ساتھیوں کو لے کر ان کے درمیان سے ہجرت کر جاتے اور کسی آزاد ماحول میں جا مقیم ہوتے۔ جہاں انھیں اللہ کے دین پر بے روک ٹوک عمل کرنے اور اپنی پوری زندگی اس کے احکام کے مطابق بسر کرنے کی آزادی میسر آ جاتی۔ دوسرے لفظوں میں اللہ کا بھیجا ہوا دین عملاً قائم ہو جانے کی پوزیشن حاصل کر لیتا۔

● دشمنانِ حق کا خاتمہ اور دین کا مکمل قیام

ہجرت کے بعد دعوت کے دشمنوں کی جڑ بھی کاٹ دی جاتی اور سنتِ الٰہی کے مطابق دنیا کو ان کے وجود سے پاک کر دیا جاتا۔ کیونکہ جو لوگ نیکی اور سچائی سے اس قدر بیزار ہوتے کہ اللہ کے پیغمبر تک کو برداشت کرنے سے آخری حد تک انکار کر دیتے، وہ واضح طور پر انسانیت کے جسم پر سڑے ہوئے ناسور کی حیثیت رکھتے تھے، جسے باقی رکھنے کا کوئی عقلی یا اخلاقی جواز نہیں رہ جاتا تھا۔ دشمنانِ حق کے اس خاتمے کی، دو میں سے کوئی ایک شکل ہوتی: یا تو اہلِ ایمان کی قوت

بازو کے ذریعہ انھیں ختم کرادیا جاتا ـــــــ اور یہ صورت اس وقت ہوتی جب یہ بندگان خدا ایک معقول تعداد میں ہوتے ـــــــ یا پھر قدرت الٰہی براہ راست خود حرکت میں آجاتی اور پردۂ غیب سے عذاب ہلاکت بھیج کر انھیں بالکلیہ تہس نہس کرڈالتی ـــــــ اور ایسا اس وقت ہوتا جب اہل ایمان بہت کم ہوتے اور اپنی افرادی قوت اور سروسامان کی قلت کی بنا پران سے عہدہ برآ ہونے کی پوزیشن میں نہ ہوتے ـــــــ منکرین حق کی اس بیخ کنی کے بعد دین حق کو اپنا مقام پوری طرح مل جاتا اور اللہ کی سرزمین پر اس کا بھیجا ہوا نظام بندگی ونظام زندگی نافذ ہوجاتا اور دعوت اپنی منزل مقصود تک پہنچ جاتی۔[1]

(۲) اہل کتاب وشریعت کے درمیان

اب ان انبیاءؑ کے نقشۂ کار کو لیجیے جن کی بعثت تمام ترکسی سابق پیغمبر کے ماننے والوں اور ایسے لوگوں کے درمیان ہوئی تھی جو توحید وآخرت، وحی ورسالت اور کتاب وشریعت، سبھی چیزوں سے فی الجملہ واقف، اور ان کے تسلیم کرنے والے ہوتے۔

اس سلسلے میں سب سے پہلے ایک اہم ترین بنیادی حقیقت سامنے رکھ لیجیے اور وہ یہ کہ ان انبیاء کی دعوتوں کا آخری مقصود بھی اگرچہ وہی اقامت دین ہی تھا جو پچھلی قسم کے انبیاء کی دعوتوں کا تھا۔ لیکن ان کے مخاطب گروہ کی حیثیت کے مختلف ہونے کی وجہ سے ان کی دعوتیں بھی قدرتی طور پر ان دعوتوں کے مقابلے میں قدرے مختلف حیثیت اور نوعیت کی تھیں۔ ان کے

[1] اس مسئلہ پر آج کی دنیا کو ذہن میں رکھ کر نظر نہ ڈالنی چاہیے۔ ورنہ سخت الجھن پیش آئے گی۔ آج تو دنیا کا چپہ چپہ کسی نہ کسی کا مقبوضہ بن چکا ہے، لیکن ہزاروں سال قبل جب کہ ان انبیاء کی بعثت ہوئی تھی، بیشتر علاقے خالی اور بے قبضہ پڑے تھے۔ اسی طرح آج حکومت کا بھی مفہوم انتہائی وسیع اور منضبط ہوچکا ہے، جب کہ ان دنوں یہ مفہوم بہت سادہ اور مختصر ہوا کرتا تھا۔ آبادیاں چھوٹی چھوٹی، مسائل محدود اور ضرورت کے قوانین حددرجہ سادہ ومختصر۔ عمران، تمدن اور سیاست کے ان حالات اور ابتدائی ادوار میں ان انبیاء کی بعثت ہوئی تھی، جن کے پاس اللہ کا دیا ہوا صرف دین ہی نہیں بلکہ شریعت (ضابطۂ حیات) بھی ہوتا تھا۔ (وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنكُمْ شِرْعَةً وَّ مِنْهَا جاً) جو قدرتی طور پر سادہ اور مختصر ہی ہوا کرتا تھا۔ اب ظاہر ہے کہ ہجرت کے بعد ان انبیاء کا نیا مستقر کوئی آزاد علاقہ ہی بنا کرتا تھا، جہاں اپنی اور اپنے ساتھی اہل ایمان کی زندگی اللہ کی شریعت کے مطابق بسر کرنے میں انھیں کوئی رکاوٹ پیش نہیں آتی تھی اس لیے یقینی بات ہے کہ انھوں نے اپنے دارالہجرت میں پہنچ کر احکام الٰہی کا اپنی پوری زندگی پر نفاذ کرلیا تھا، واضح لفظوں میں اللہ کے دین کو مکمل طور پر قائم کرلیا تھا۔

مخاطب چونکہ ان کی بنیادی تعلیمات سے نا آشنا اور ان کے منکر نہیں تھے، بلکہ فی الجملہ ان کے جاننے اور ماننے والے تھے، اس لیے انھیں نہ کافر و مشرک قوموں کے مقام پر رکھ کر خطاب کیا جاسکتا تھا نہ اس طریقے سے دعوت دی جاسکتی تھی جس طریقے سے انھیں دی گئی تھی۔ اس بنیادی فرق کی وجہ سے جہاں وہ دعوتیں ''دعوت ایمان'' تھیں، وہاں یہ دعوتیں دعوت اصلاح تھیں۔ زیادہ واضح لفظوں میں اور معروف تعبیر کے مطابق، یہ دعوتیں ''احیاء دین'' اور ''اصلاح امت'' کی دعوتیں تھیں، جب کہ پہلی قسم کے انبیاء کی دعوتیں ''تاسیس دین'' اور ''تشکیل امت'' ـــــ دین کی بنیاد رکھنے اور ایک نئی امت بنانے ـــــ کی دعوتیں تھیں۔

نوعیت کے اس فرق کی بناء پر ان دعوتوں کا نقشۂ کار بھی بہت کچھ مختلف تھا، جس کے بنیادی خطوط قرآن کریم نے یہ بتائے ہیں:

● اپنی نبوت پر ایمان لانے کا مطالبہ

ان انبیاء نے لوگوں کے سامنے پہلے اس بات کا اعلان اور اپنی اس حیثیت کا اظہار کیا کہ ہم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھیجے ہوئے رسول ہیں۔ ہم تمہاری ہدایت اور اصلاح کے لیے آئے ہیں، اس لیے ہماری اس حیثیت کو تسلیم کرو، ہم پر ایمان لاؤ اور ہماری اطاعت اور پیروی کرو۔ اپنی نبوت پر ایمان لانے کا ان کا یہ مطالبہ ان کی دعوت کا بنیادی پتھر تھا اور یہ مطالبہ اس لیے تھا کہ ان کی نبوت کو تسلیم کیے بغیر ان کی دعوت اصلاح کے قبول کیے جانے کا کوئی امکان ہی نہیں تھا۔

● سچی خدا پرستی کی تلقین

اپنی نبوت کے سوا انھوں نے ایمانیات میں سے کسی اور شے ـــ توحید و آخرت، یا کتاب و شریعت، یا نفس وحی و رسالت وغیرہ ـــ پر ایمان لانے کا ان سے مطالبہ نہیں کیا، نہ ان امور سے انھیں شناسا بنانے کی کوئی کوشش کی۔ جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا، اس کی وجہ بالکل صاف ہے۔ یہ لوگ نہ ان چیزوں سے ناواقف تھے، نہ ان کے منکر۔ ان کے لیے نہ خدا اور اس کی صفات کا تصور بالکل نیا تھا، نہ رسالت اور آخرت کا۔ البتہ ان کے تصورات میں خرابی ضرور پیدا ہوچکی تھی اور ان کے عقائد بالکل صحیح اور بے داغ نہیں رہ گئے تھے۔ جہاں تک ان کے اعمال و اخلاق کا تعلق ہے وہ تو قریب قریب بالکل ہی فسق و فجور میں غرق ہوکر رہ گئے تھے۔ اس لیے جو

بات ان سے کہنے کی ہونی چاہیے تھی وہ یہ نہیں تھی کہ لوگو! خدا کی ذات پر، اس کی توحید پر، آخرت پر اور کتاب و نبوت پر ایمان لاؤ، بلکہ یہ تھی کہ اپنے عقائد کی خامیاں دور کرو، اپنے عمل میں سچی خدا پرستی اور آخرت پسندی پیدا کرو اور جس توحید، جس آخرت، جس کتاب اور جس شریعت پر ایمان رکھنے کا تمھیں دعویٰ ہے ان کے عملی تقاضے پورے کرو۔ چنانچہ ان انبیاء کی دعوت اسی مرکزی نقطہ پر برابر گھومتی رہی۔ ان کی ساری کوشش یہی رہتی کہ لوگ نہ اللہ و آخرت اور کتاب و شریعت کو من مانے طریقہ سے ماننے کا وطیرہ اختیار کریں، نہ ان باتوں کے صرف مان لینے ہی کو سب کچھ سمجھے رہیں، جیسا کہ اس وقت ان کا حال تھا، بلکہ خدا کی سچی بندگی بھی کریں، آخرت کی واقعی فکر کو بھی اپنے دل میں جگہ دے لیں۔ اللہ کے پیغمبر کی مکمل پیروی بھی کریں اور اپنے عقائد و افکار کو، اپنے اخلاق و اعمال کو اور اپنے مسائل و معاملات کو شریعت کے سانچے میں ڈھال بھی لیں۔ غرض اپنی زندگی کو ان تمام باتوں سے پاک کرلیں جو ایمان بالحق سے میل نہ کھاتی ہوں اور اپنے نفس کو دنیا پرستی اور آخرت فراموشی کی گرفت سے آزاد کرا کے اپنے پورے رویے میں اپنے پروردگار کے تابع امر بن جائیں۔

● پیروانِ دعوت کی تنظیم اور تربیت

جو لوگ پیغمبر پر ایمان لاتے گئے اور دعوت کے ساتھ ہوتے گئے ان کی ایمانی اور عملی تربیت کا اور انھیں ایک مضبوط اجتماعی نظم میں متحد و یک جہت بنا دینے کا، اللہ کے یہ رسول بھی اسی طرح اہتمام کرتے رہے جس طرح کہ اہل شرک و کفر کے درمیان معبوث ہونے والے انبیاء کیا کرتے تھے ـــــ اور جس کی تفصیل ابھی عرض کی جا چکی ہے۔

● دعوت و اصلاح کے کام میں پیروانِ دعوت کی شرکت

ساتھ ہی ساتھ وہ لوگ بھی دعوت اور اصلاح ملت کے کام میں نبی کے دست و بازو بنتے گئے جو اس پر ایمان لاکر دعوت کو قبول کر چکتے تھے۔ نبی کی طرح ان کا بھی اصل وظیفۂ حیات دوسرے بندگانِ خدا کو ان کا بھولا ہوا فریضۂ زندگی یاد دلانا اور صحیح معنوں میں مومن و مسلم بنا دینا ہو جایا کرتا تھا۔

● ملت کے دوسرے مسائل کی طرف مشروط اور محدود توجہ

یہ دعوت بھی اپنی جدو جہد کے نتیجہ میں، ظاہر ہے دو ہی صورتوں سے دوچار ہوسکتی ہے: یا تو صرف تھوڑے ہی سے لوگ اس کے حلقہ بگوش بنتے یا اس کی آواز پر لبیک کہنے والوں کی ایک بڑی تعداد ہوتی۔

پہلی صورت میں پیغمبر اپنی کوششوں کا محور آخر دم تک اسی دعوت و اصلاح امت ہی کو بنائے رکھتے اور اپنے حواریوں کو بھی اسی جدو جہد میں تمام و کمال مصروف رکھتے .... وہ ایک بستی سے دوسری بستی تک، ایک مقام سے دوسرے مقام تک یہی منادی کرتے رہتے کہ اللہ کے بندو! صحیح معنوں میں اس کے بندے بن جاؤ۔ اس ایک کام کے سوا قوم کے اور کسی مسئلے کی طرف مطلق توجہ نہ کرتے ـــــ اس کی سب سے نمایاں مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے۔

دوسری صورت میں پیغمبر اپنی توجہات اور اپنی کوششوں کا دائرہ بتدریج وسیع سے وسیع تر کرتے رہتے۔ قوم کے مسائل کو اپنے مسائل سمجھتے اور انھیں حل کرنے کے لیے ہر وہ تدبیر اور کوشش اختیار کرتے جو اختیار کی جاسکتی تھی۔ لیکن یہاں بھی ایسا کبھی نہ ہوتا کہ یہ مسائل ان کی عملی توجہ کا مرکز بن گئے ہوں۔ مرکز توجہ تو ان کا ہر حال میں دعوت الی الخیر، اصلاح عقائد و اعمال اور تزکیۂ نفوس ہی کا کام رہا، جیسا کہ ہونا بھی چاہیے تھا۔ کیونکہ یہی تو ہر فرد اور ہر قوم کی طرح ان قوموں اور ملتوں کا بھی حقیقی اور بنیادی مسئلہ تھا، جس کے بعد ہی دوسرے مسائل کو کوئی اہمیت دی جاسکتی تھی اور جس کے صحیح حل ہی پر باقی ہر مسئلے کا واقعی حل موقوف تھا۔

● منکرین دعوت سے معنوی ہجرت

ان انبیاء کو معروف معنوں کی ہجرت اور جنگ و جہاد کے مراحل تو پیش نہیں آئے، جس طرح کہ اہل شرک و کفر کے درمیان مبعوث ہونے والے انبیاء کو پیش آتے رہے ہیں، اسی طرح ان کے مخالفوں پر غیب سے کوئی ایسا عذاب بھی نہیں آیا جس نے انھیں یکسر نیست و نابود کر کے رکھ دیا ہو ـــــ جس کی وجہ دراصل ان دعوتوں کی یہ مخصوص حیثیت تھی کہ وہ اہل شرک و کفر کے درمیان نہیں، بلکہ اہل کتاب و شریعت کے درمیان کام کر رہی تھیں اور ان کے مخالف سب کچھ ہونے کے باوجود، اللہ اور اس کی ہدایت کے بارے میں کفار و مشرکین کی سطح پر ہرگز نہیں

تھے ــــــ لیکن حقیقت یہ بھی نہیں ہے کہ معناً بھی یہ مراحل پیش نہ آئے ہوں۔ چنانچہ جن لوگوں نے انکار اور مخالفت کا قطعی رویہ اختیار کرلیا تھا، انبیاء علیہم السلام نے ان سے آخر میں پوری طرح بے تعلقی اختیار کرلی تھی اور دنیا سے رخصت ہوتے وقت ان پر لعنت بھیج کر رخصت ہوئے تھے۔

لُعِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْٓ اِسْرَآئِيْلَ عَلٰی لِسَانِ دَاؤُدَ وَعِيْسَى ابْنِ مَرْيَمَ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّ كَانُوْا يَعْتَدُوْنَ (مائدہ:۷۸)

(بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤدؑ اور عیسیٰ ابن مریم کی زبان سے لعنت کی گئی کیوں کہ وہ سرکش ہوگئے تھے اور زیادتیاں کرنے لگے تھے۔)

حتی کہ دوسری صورت میں بھی، جب کہ قوم پوری کی پوری، یا اس کی عظیم اکثریت، پیغمبر کے ساتھ ہو چکی تھی، اس نے جب کبھی اس کی واضح ہدایات اور احکام سے سرتابی کی تو اسے بھی قریب قریب اسی انجام سے دوچار ہونا پڑا، حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تاریخ دعوت سے اس حقیقت کا واضح ثبوت ملتا ہے۔ آپؑ کے حکم جہاد کی تعمیل سے جب بنی اسرائیل نے انکار کردیا تو انھوں نے خدا سے فریاد کرتے ہوئے ان سے خود کو بری اور علیٰحدہ کردیے جانے کی دعا کی اور یہ دعا، جو دراصل بنی اسرائیل کی موجودہ نسل پر لعنت کردینے کے ہم معنی تھی، قبول بھی ہوئی۔ چنانچہ اس کے نتیجے میں وہ مقدس سرزمین موعود (فلسطین) کی باعزت اور با اقتدار ملی زندگی سے محروم رہ کر سینا کے صحرا میں بھٹکتی رہ گئی۔

قَالَ رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَ بَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. قَالَ فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ فَلَا تَاْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ. (المائدہ: ۲۵-۲۶)

(اس پر موسیٰ نے کہا اے میرے رب، میرے اختیار میں کوئی نہیں مگر میری اپنی ذات یا میرا بھائی پس تو ہمیں اب نافرمان لوگوں سے الگ کردے۔ اللہ نے جواب دیا: اچھا تو وہ ملک چالیس سال تک ان پر حرام ہے، یہ زمین میں مارے مارے پھریں گے، ان نافرمانوں کی حالت پر ہرگز ترس نہ کھاؤ۔)

دعوتی جدوجہد کا تسلسل

جن پیغمبروں کی زندگی میں دعوت اپنی منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکی ــــ اور اکثر ایسا ہی

ہوں— ان کے انتقال کے ساتھ دعوت کا سلسلہ بھی موقوف نہیں ہو گیا، بلکہ برابر جاری رہا، ان کے حواری اور بعد کے اہل ایمان ان کے مشن کی مسلسل علمبرداری کرتے رہے۔ تاآنکہ روشنی ہر طرف پھیل گئی، مخالفتوں کا زور توڑ دیا گیا اور داعیان حق کو اللہ تعالیٰ نے غلبہ واقتدار سے نواز دیا۔ اور دعوت اپنی منزل تک پہنچ گئی— اس امر واقعی کی واضح مثال حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی دعوت ہے، جس پر ایمان لانے والے آپؑ کی موجودگی میں تو صرف بارہ افراد تھے، لیکن آپ کے بعد بھی آپ کے سچے پیرووں کے ذریعہ یہ دعوت برابر پھیلتی رہی۔ یہاں تک کہ وہ وقت آ گیا جب وہ اور اس کے علمبردار، مخالفوں پر غالب ہو گئے۔ قرآن مجید کے ان الفاظ میں تاریخ کا یہی روشن باب بیان ہوا ہے۔

فَاٰمَنَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ بَنِیْٓ اِسْرَآئِیْلَ وَ کَفَرَتْ طَّآئِفَةٌ فَاَیَّدْ نَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا عَلٰی عَدُوِّھِمْ فَاَصْبَحُوْا ظٰھِرِیْنَ. (الصف : ۱۴)

(اس وقت بنی اسرائیل کا ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے گروہ نے انکار کیا پھر ہم نے ایمان لانے والوں کی ان کے دشمنوں کے مقابلے میں تائید کی اور وہی غالب ہو کر رہے۔)

(۳) بیک وقت اہل کفر و اہل کتاب دونوں گروہوں کے درمیان

ان انبیاء کا نقشۂ کار جن کے مخاطب حقیقی اور ضمنی کے فرق کے ساتھ اہل کتاب و شریعت اور اہل کفر و شرک، دونوں ہی قسم کے لوگ تھے، قدرتی طور پر دوگونہ اور جامع نوعیت کا تھا۔ یعنی انھوں نے ایک طرف تو کفار و مشرکین کو دعوت دینے کے سلسلے میں وہ خطوط کار اختیار فرمائے جو اس طرح کے لوگوں میں مبعوث ہونے والے انبیاء کے خطوط کار رہے ہیں— اور جن کی وضاحت ابھی کی جا چکی ہے— دوسری طرف سابق پیغمبر کے ماننے والے، اہل کتاب و شریعت گروہ کے بارے میں دعوت کے اس طریقے اور نقشۂ کار پر عمل کیا جو دوسری قسم کے انبیاء کا، جن کی بعثت صرف اہل کتاب و شریعت ہی کے اندر ہوئی تھی، طریقہ اور نقشۂ کار رہا ہے— اور اس کی تفصیل ابھی بیان ہو چکی ہے—

بیک وقت دو طرح کے مخاطب ہونے اور دو قسم کے طریق ونقشہ کار اختیار کرنے کے باعث ان انبیاء کے کام میں کچھ مخصوص نزاکتوں اور پیچیدگیوں کا پیدا ہو جانا بھی ایک قدرتی امر تھا۔ لیکن پیغمبرانہ بصیرت پورے اعتدال اور توازن کے ساتھ ان نزاکتوں اور پیچیدگیوں سے عہدہ برآ ہوتی رہتی تھی اور کسی گروہ کے حق میں کبھی کوئی افراط یا تفریط نہ ہونے پاتی تھی۔ ہر ایک کے سلسلے میں داعی حق اپنا دعوتی فریضہ بالکل صحیح طور پر ادا کرتا رہتا تھا۔

جہاں تک ہجرت کا تعلق ہے، اس کا انحصار صرف اہل کفر گروہ کے رویے پر رہتا۔ اگر اتمام حجت کے بعد بھی اس کی بہت بڑی اکثریت دعوت کو قبول نہ کرتی، بلکہ اسے برداشت کرنے سے بھی انکار کر دیتی، تو پیغمبر اپنے پیروؤں کے ساتھ ہجرت کر جاتا، ورنہ اپنی جگہ برقرار رہتے ہوئے اپنے مشن کی تکمیل میں بدستور مصروف رہتا۔ چنانچہ حضرت موسیؑ نے ہجرت کی، جب کہ حضرت یوسفؑ کو یہ مرحلہ پیش نہیں آیا۔

(۴) نبی آخر الزّماں صلی اللہ علیہ وسلم کا نقشۂ کار

آخری رسول حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی، چونکہ کئی پہلوؤں سے ایک مخصوص نوعیت تھی، آپؐ سارے عالم کے لیے اللہ کے رسول تھے اور ہمیشہ کے لیے تھے، آپؐ کے مخاطب اہل شرک وکفر اور اہل کتاب دونوں ہی قسم کے لوگ تھے اور ان میں سے کسی گروہ کی طرف یہ بعثت ضمناً نہیں تھی ـــ جیسا کہ حضرت یوسف اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کی بعثت قبطی قوم کی طرف ضمنی تھی ـــ اس لیے آپؐ کا نقشۂ کار بھی ایک منفرد نوعیت کا حامل تھا، جو قرآن حکیم اور تاریخ کے صفحات میں پوری وضاحت سے موجود ہے۔ اس نقشے کے بنیادی خطوط یہ ہیں:

الف۔ خطاب کی ترتیب

چونکہ آنحضرتؐ کی بعثت عام اور عالمگیر تھی اور ایک دو نہیں، بلکہ سارے ہی انسانی گروہ آپ کے مخاطب تھے، اس لیے ضروری تھا کہ دعوت پیش کرنے کے لیے مختلف گروہوں اور

قوموں میں ایک ایسی ترتیب قائم کر لی جائے اور انھیں ایسی تدریج کے ساتھ خطاب کیا جائے جو حصول مقصد کے لیے سب سے زیادہ موزوں اور کامیاب ثابت ہو۔ کیونکہ بیک وقت کسی ایک قوم یا ایک خطہ ارض کے تمام باشندوں کو دعوت پیش کرنا تو ضرور ممکن اور قابل عمل ہے، جیسا کہ پچھلے تمام پیغمبروں کے لیے رہتا ہی رہا ہے، لیکن پوری دنیا کو دعوت پیش کر دینا آج بھی ممکن اور قابل عمل نہیں جب کہ نشر واشاعت کی غیر معمولی آسانیاں فراہم ہو چکی ہیں، پھر چودہ سو برس پہلے کے زمانے میں اس کے ممکن ہونے کا کیا سوال پیدا ہو سکتا تھا؟ اور اگر بالفرض ایسا ممکن بھی ہوتا تو بھی یہ کوئی معقول اور دانشمندانہ بات بالکل نہ ہوتی کہ بیک وقت تمام ہی انسانوں اور سبھی قوموں کو خطاب کرنا شروع کر دیا جاتا۔ کیونکہ دعوت صرف اس کا نام نہیں ہے کہ بس حق کے بیج ہر طرف بکھیر دیے جائیں۔ بلکہ اس کام کا نام ہے کہ پہلے امر حق کی، موزوں انداز میں تخم ریزی کی جائے، پھر ایک ہوشیار اور محنتی کسان کی طرح اس کی مسلسل پرداخت اور نگہداشت کی جائے۔ اس لیے آنحضرت ﷺ نے ہدایت الٰہی کے تحت مختلف قوموں کو خطاب کرنے کے لیے ایک خاص ترتیب رکھی، جو یہ تھی:

(۱) سب سے پہلے آپ نے مشرکین عرب (بنی اسماعیل) کو خطاب کیا اور ایک مدت تک انہی پر اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ یہاں تک کہ ان میں سے ایک خاصی بڑی تعداد دولت ایمان سے سرفراز ہو گئی اور اس طرح ایک ایسا گروہ تیار ہو گیا جو آیندہ اس دعوت کی سچی پیروی ہی کا نہیں بلکہ اس کی صحیح علمبرداری کا بھی حق بخوبی ادا کر سکنے کے قابل تھا۔

(۲) بنی اسماعیل پر اس حد تک دعوت پیش کر چکنے کے بعد، مدینہ اور اس کے اطراف میں بسنے والے اہل کتاب ـــــ یہود ونصاری ـــــ کو دعوت پیش کرنے کا کام شروع کیا گیا۔

(۳) پھر اطراف عرب کے ممالک میں رہنے والی دوسری قوموں تک ـــــ خواہ وہ اہل کتاب میں سے رہی ہوں یا مشرکوں میں سے ـــــ دعوت پہنچانے کا اہتمام کیا گیا۔

(۴) آخر میں دور دراز کی دوسری اقوام سے دعوت قبول کرنے کا مطالبہ کیا گیا اور یہ سلسلہ خلافت راشدہ کے اختتام تک قائم رہا ـــــ اور ابھی اس وقت تک قائم رہنا چاہیے جب تک کہ ساری دنیا دین حق کی تابع نہ بن جائے۔

اس ترتیب کا مطلب یہ بالکل نہیں ہے کہ جب تک ایک گروہ کو دعوت پہنچانے کا کام

ہر طرح سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ گیا اس وقت تک دوسرے کی طرف مطلق توجہ نہیں کی گئی بلکہ صرف یہ ہے کہ اسے بحیثیت قوم خطاب نہیں کیا گیا اور اسے مرکز توجہ نہیں بنایا گیا۔ چنانچہ جب بھی کوئی فطری موقع ملا، دوسرے گروہ کے لوگوں کو اس دوران بھی حق کی طرف بلایا ہی جاتا رہا۔

اگر آپ ایک عالمگیر تحریک کی مصالح کو سامنے رکھ کر غور کریں گے تو صاف طور پر محسوس کرلیں گے کہ یہی اس دعوت کے اختیار کرنے کی سب سے فطری اور منطقی ترتیب تھی۔ چنانچہ بنی اسماعیل ــــــ مشرکین عرب ــــــ کو آنحضرت ﷺ نے سب سے پہلے اپنی دعوتی جدو جہد کا مرکز اس لیے بنایا کہ آپؐ انہی کے اندر پیدا ہوئے تھے، انہی کے درمیان رہتے تھے۔ اس لیے یہی لوگ فطری طور پر آپ کا اولین دائرہ کار تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ ان کی طرف آپ کی بعثت ہر پہلو سے براہ راست تھی، جب کہ دوسروں کی طرف بالعموم بالواسطہ، یعنی اسی مخاطب اول گروہ کے توسط سے تھی ــــ جس کی وجوہ و مصالح بآسانی سمجھی جاسکتی ہیں ــــ اسی طرح ایک طویل مدت تک انہی لوگوں کو مرکز توجہ بنائے رکھنے کی ضرورت اور مصلحت یہ تھی کہ یہ دعوت ایک عالمگیر اور ابدی دعوت تھی، جب کہ اس کے داعیٔ مبعوث کی زندگی بہر حال قوانین طبیعی کی پابند اور محدود مدت ہی کے لیے تھی۔ اس لیے اسے منزل مقصود تک پہنچانے کی معقول اور کامیاب عملی شکل صرف یہی ہوسکتی تھی کہ آپؐ اپنی توجہ پہلے ایک محدود خطۂ ارض اور کسی ایک ہی قوم پر مرکوز رکھ کر ایک ایسی جماعت ــــ امت ــــ تیار کردیں جو آیندہ بھی اس دعوت کی علم برداری کا فرض بدستور انجام دیتی رہے اور دوسری اقوام تک پیام حق پہنچانے کے لیے آپ کی قائم مقامی کرتی رہے۔

مکہ میں، جو مشرکینِ عرب کا دینی اور سماجی مرکز تھا، دعوت و تبلیغ کا حق ادا کرکے جب آپؐ ہجرت کے بعد مدینے پہنچ گئے، جہاں یہود و نصاریٰ بھی آباد تھے، جو خود بھی آشنائے وحی و رسالت تھے اور اس لیے اس دعوت کے لیے اجنبی نہ تھے، تو انھیں بھی خطاب کرنے اور براہ راست دعوت دینے کا وقت آگیا، جو فطری بھی تھا اور ان کے اہل کتاب ہونے کے باعث نسبتاً زیادہ ضروری بھی۔ جب ضروری حد تک ان لوگوں پر اور ساتھ ہی ساتھ باقی مشرکین عرب پر بھی، دین حق کی تبلیغ و تفہیم کا کام انجام پاچکا اور ان میں سے جو لوگ ایمان لانے کے لیے تیار نہیں ہوئے ان کی مخالفتوں کا زور بھی بڑی حد تک ٹوٹ گیا، تو اب قدرتی طور پر وہ وقت آ گیا

جب اندرون عرب کی طرف سے فی الجملہ مطمئن ہوکر بیرون عرب کی قوموں تک دعوت اسلام پہنچائی جاتی اور پھر ان کے بعد دور کی دوسری قوموں کو اس دین کو قبول کرنے کی دعوت دینے کا قدرتی موقع آیا۔

ب۔ مشرکین عرب میں دعوت کا نقشۂ کار

مشرکین عرب کے اندر آپؐ نے کام کا جو نقشہ اختیار فرمایا وہ دعوت کی ابتداء سے لے کر ہجرت تک تمام تر وہی تھا، جیسا کہ ہونا ہی چاہیے تھا، جو پہلی قسم کے یعنی اہل شرک وکفر قوموں کے اندر مبعوث ہونے والے انبیاء کا رہا ہے ـــ اور جس کی پوری تفصیل اوپر معلوم ہو چکی ہے۔

ج۔ اہل کتاب کے سلسلے میں دعوت کا نقشۂ کار

اہل کتاب کو دعوت دینے کا نہج بھی کچھ فرق کے ساتھ وہی تھا جو اس طرح کے لوگوں کے اندر مبعوث ہونے والے حضرات انبیاء کا رہتا رہا ہے۔ یہ فرق جو بالکل فطری اور منطقی اسباب کا نتیجہ تھا، دو اہم باتوں کا تھا: ایک تو یہ کہ ان لوگوں سے ایک نئے پیغمبر کے ساتھ ساتھ ایک نئی کتاب اور ایک نئی شریعت پر بھی ایمان لانے کا مطالبہ کیا گیا۔ دوسری یہ کہ ان میں سے جو لوگ ایمان لاتے گئے ان کے سابق ملّیت برقرار نہیں رہ گئی بلکہ وہ ایک جدید ملت اور امت کے اجزاء بنتے گئے۔

د۔ اطرافِ عرب اور دوسری قوموں کے متعلق نقشۂ کار

عرب سے باہر رومیوں، ایرانیوں اور دوسری تمام قوموں میں دعوت کا انداز اور نقشۂ کار اس انداز سے بہت کچھ مختلف تھا جو عربوں کے سلسلے میں اختیار کیا گیا تھا۔ اگرچہ اصل دعوت میں اور اس کے مطالبات میں کوئی ابہام یا رواداری مطلق نہ تھی، لیکن اس کے پیش کرنے کے سلسلے میں دلیل و برہان، تکرار بیان اور افہام و تفہیم کی وہ پیہم کوششیں انجام نہیں دی گئیں۔ جو عربوں کے سلسلے میں انجام دی گئی تھی۔ بس ایک بار اس کا پیش کر دینا کافی سمجھا گیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اب اسلام کی صداقت عقلی دلائل کی محتاج نہیں رہ گئی تھی، بلکہ ایک آنکھوں دیکھی حقیقت بن چکی تھی۔ اللہ کا دین اپنے پورے وجود کے ساتھ انسانی زندگی پر نافذ ہوکر اپنی حقانیت کی آپ دلیل بن چکا

تھا۔اس لیے اب دنیا کی کسی اورقوم کے سلسلے میں مزید کسی اتمام حجت کی ضرورت باقی نہیں رہ گئی تھی۔آفتاب کی آمد خود اس کے وجود کی دلیل بن چکی تھی اور ایک بار اس کا نظارہ کرادینا کافی تھا۔

ان قوموں کو خواہ وہ اہل کتاب رہی ہوں خواہ مشرک، دعوت دینے کے لیے ان کے سربراہوں اور حکمرانوں کو منتخب کیا گیا، جیسا کہ طریق دعوت کا اصولی تقاضا تھا۔ان حکمرانوں میں سے اکثر کے پاس نبی ﷺ نے خود دعوت نامے بھجوائے اور ان سے اسلام قبول کرنے یا پھر سیاسی اقتدار سے دست برداری کے مطالبے کیے۔یعنی مطلوب حقیقی تو یہی تھا کہ وہ اور ان کی متابعت میں ان کے عوام بھی، دولت حق سے بہرہ ور رہیں، لیکن اگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوں تو اسلام کے اجتماعی نظام کے قیام کی راہ ضرور چھوڑ دیں۔

ان قوموں میں سے بعض نے تو اسلام قبول کرلیا، بعض نے اس کی صرف سیاسی محکومی اختیار کی اور اکثر نے اس کی مخالفت کا فیصلہ کرلیا اور جنگ پر آمادہ ہوگئیں۔چنانچہ اس طرح کی جنگوں کا سلسلہ، جس کی ابتدا دور نبوت ہی میں ہوچکی تھی، خلفائے راشدین کے آخری زمانے تک جاری رہا۔یہاں تک کہ وقت کی حکمراں تہذیب کی علمبردار بڑی بڑی حکومتوں نے ہتھیار ڈال دیے اور اللہ کا بھیجا ہوا دین اور اسلامی نظام سارے دینوں اور نظاموں پر غالب ہوگیا۔یعنی دعوت قرآنی اپنی اس منزل مقصود تک پہنچ گئی جس کا تعین اور اعلان فرمان خداوندی میں کیا گیا ہے:

هُوَ الَّذِیٓ اَرۡسَلَ رَسُوۡلَهٗ بِالۡهُدٰی وَدِیۡنِ الۡحَقِّ لِیُظۡهِرَهٗ عَلَی الدِّیۡنِ کُلِّهٖ. (الفتح: ۲۸)

(وہ اللہ ہی ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق کے ساتھ بھیجا ہے تاکہ اس کو پوری جنس دین پر غالب کردے۔)

تحریک اسلامی ہند کا نقشۂ کار

حضرات انبیاء علیہم السلام کے یہی دعوتی نقشہ ہائے کار دوسری ہر اسلامی تحریک ودعوت کی طرح ہماری اس زیر بحث تحریک اسلامی کے لیے بھی سرچشمۂ ہدایت تھے اس لیے اس نے جو

اپنا نقشۂ کار بنایا ہے وہ تمام تر انہی کو سامنے رکھ کر بنایا ہے۔ اس سلسلے میں چونکہ حقیقت واقعی یہ تھی کہ وہ مختلف انبیائی دعوتوں میں سے کسی بھی ایک دعوت کے پوری پوری مشابہ نہیں تھی، اس لیے ان میں سے کسی ایک ہی دعوت کے نقشۂ کار کو جوں کا توں اختیار کر لینا بھی اس کے لیے صحیح نہ تھا۔ چنانچہ اس کے مخاطب نہ تو صرف اہل شرک وکفر تھے کہ وہ پہلی قسم کے انبیاء کی دعوتوں کے عین مشابہ ہوتی، نہ صرف اہل کتاب وشریعت ـــــ صرف مسلمان ـــــ تھے کہ وہ دوسری قسم کی دعوتوں کے کلیتہً ہم رنگ ٹھہرتی، نہ وہ اصل مخاطب اور ضمنی مخاطب میں منقسم تھے کہ وہ بہر طور تیسری قسم کی دعوتوں جیسی دعوت قرار پاتی، نہ وہ اہل شرک وکفر کے ساتھ ساتھ ایسے اہل کتاب وشریعت پر بھی مشتمل تھے جن کے لیے یہ دعوت کسی پہلو سے بھی کوئی نئی دعوت ہوتی اور ان سے اس پر ایمان لانے کے مطالبے کا کوئی سوال پیدا ہو رہا ہوتا کہ وہ چوتھی قسم کی دعوت کے عین مطابق سمجھی جاتی۔ ان تمام صورتوں کے برخلاف وہ ایک ایسی دعوت تھی:

جس کی حیثیت بنیادی طور پر ایک عالمگیر دعوت کی تھی، اہل کفر وشرک اور اہل کتاب سبھی اس کے مخاطب تھے اور ہر گروہ اس کا اصلی مخاطب تھا، کسی کی بھی حیثیت اس کے ضمنی مخاطب کی نہیں تھی۔

جس کے مخاطب گروہوں میں ایک ایسا گروہ بھی موجود تھا جو اسلام، قرآن اور رسالت محمدی پر ایمان رکھتا تھا اور اس لیے اپنی اصل حیثیت سے وہ اس دعوت کے لیے اور یہ دعوت اس کے لیے کسی طرح بھی غیر نہیں تھی۔ اس کے عقائد اور اس کے مقاصد سب کے سب اس گروہ کے اپنے ہی عقائد و مقاصد تھے۔ اس کے باوجود دعوت کو اسے بھی اپنا مخاطب بنانے کی ضرورت صرف اس لیے پیش آئی کہ اس کے اندر ایمان کی کمزوری اور عمل کی خرابی پیدا ہو چکی تھی اور وہ اپنے مشن سے بالعموم غافل ہو کر رہ گیا تھا۔ چنانچہ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو وہ اس دعوت کا مخاطب بھی نہ بنتا، بلکہ خود اس کا علمبردار ہوتا۔

اپنی اس مخصوص نوعیت کی بنا پر یہ تحریک جہاں انبیائی دعوتوں میں سے کسی بھی ایک دعوت سے کلی طور پر مشابہت نہیں رکھتی تھی، وہاں اپنی مختلف حیثیتوں میں مختلف قسم کی دعوتوں کے عین مشابہ بھی تھی۔ مثلاً اس حیثیت سے تو، کہ اس کا خطاب بالکل عام تھا اور اہل شرک وکفر اور اہل کتاب وشریعت سبھی اس کے اصل اور راست مخاطب تھے، وہ چوتھی قسم کی دعوت ـــــ دعوت

محمدی ـــــ کے مانند تھی، مگر اس حیثیت سے کہ اس کے مخاطب وہ لوگ بھی تھے جو اس کے اصول و عقائد کے ماننے والے تھے، وہ بڑی حد تک دوسری قسم کی دعوتوں کے مشابہ تھی۔ اسی طرح اس حد تک کہ اس کا خطاب اہل کفر و شرک ـــــ غیر مسلم ـــــ اقوام کی طرف بھی تھا، وہ پہلی قسم کی دعوتوں کے بھی مماثل تھی۔ اس پوری صورت واقعہ کے پیش نظر قدرتی طور پر قطعی ضروری تھا کہ وہ اپنے کام کا نقشہ بناتے وقت ان سارے پہلوؤں کو سامنے رکھتی، مختلف انبیائی دعوتوں کے نقوش راہ پر نظر ڈالتی اور جس حیثیت سے جس دعوت سے بھی مشابہت رکھتی ہوتی اس کی حد تک اسی کو مشعل راہ بناتی۔ چنانچہ اس نے ایسا ہی کیا ہے اور اپنے نقشۂ کار کے اندر جہاں ان سارے نکات کو جگہ دی ہے جو تمام انبیائی دعوتوں کے مشترکہ نکات تھے، وہیں ان نکتوں کو بھی اختیار کیا ہے جو مختلف دعوتوں نے اپنی ان مخصوص حیثیتوں کے پیش نظر اختیار کر رکھے تھے جن میں وہ ان سے مشابہت رکھتی ہے۔ اس طرح کا جو نقشۂ کار مرتب ہوا ہے اس کے بنیادی خطوط حسب ذیل ہیں:

(۱)　اصل پیغام کی اشاعت و تبلیغ

سب سے مقدم، سب سے اہم اور سب سے بنیادی کام تو تحریک کے اپنے پیغام کی نشر و اشاعت اور تبلیغ و تفہیم کا ہے۔ یعنی یہ کہ اپنے اس پیغام کو، دوسرے لفظوں میں اسلام کی دعوت کو یہ بلاتفریق مذہب وملت سارے باشندگان ملک کے سامنے پوری جامعیت، پوری وضاحت اور پورے زور استدلال کے ساتھ پیش کرتی رہے گی اور اس کے بنیادی عقائد و تصورات ـــــ توحید، رسالت محمدی اور آخرت ـــــ کو اور ان کی حقانیت کو ذہنوں میں گہرا اتار دینے کی، اور پھر ان کے عملی تقاضوں کی تکمیل پر لوگوں کو آمادہ کر دینے کی مسلسل جدوجہد میں لگی رہے گی۔ یہی اس کا اصل وظیفۂ حیات ہوگا اور اسی پر اس کی اصل توجہ مرکوز رہے گی۔ کیونکہ اس کی کامیابی کا اولین انحصار تمامتر اسی کام پر ہے، اس کام کے لیے وہ تمام ممکن اور موزوں ذرائع استعمال کرے گی۔ مثلاً لٹریچر، صحافت، تقریر، مذاکرہ وغیرہ۔

اسلام کے ''بنیادی عقائد و تصورات'' اور ان کے ''عملی تقاضوں'' کی تفصیل و وضاحت کے سلسلے میں اس کے ایک خاص عقیدے اور تصور کو خصوصی اہمیت حاصل ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اور اس کے اقتدار اعلیٰ کا عقیدہ و تصور ہے، جو اسلامی تصور توحید کا ایک بنیادی جزو اور

اسلامی نظام حیات کی اصل واساس ہے۔اس عقیدہ واصول کو خصوصی اہمیت سے پیش کرنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ اس کے اصل فکر انگیز تصور سے ذہن عام طور سے خالی ہو چکے ہیں۔ دوسروں کا کیا سوال، خود مسلمان، حتیٰ کہ ان کے بیشتر اہل علم تک اسے گویا فراموش کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ وہ چیز تھی جس کے بغیر اسلام ایک ایسے اپاہج ڈھانچے سے زیادہ اور کچھ نہیں رہ جاتا جس کی ریڑھ میں ہڈی نہ ہو اور جس سے تہی دامن ہو جانے کے بعد وہ انسانی زندگی کی شہ نشین سے لازماً محروم ہو کر ادھر اُدھر کے گوشوں میں جا پڑتا ہے۔ مختصر یہ کہ اسلامی اصول حیات میں سے حاکمیت الٰہ کے اصول کو اگر نظر انداز کر دیا جائے تو پھر اسلام کو ایک جامع دین اور مکمل نظام حیات سمجھنے کا کوئی سوال ہی باقی نہیں رہ جاتا اور جہاں یہ سوال درمیان سے غائب ہوا، وہاں دین کی اقامت اور اسلامی نظام کے قیام کی بات بھی ناقابل فہم ہو جائے گی جب کہ یہی دین کی اقامت اور اسلامی نظام کا قیام اس تحریک کا نصب العین ہے۔اس لیے مذکورہ صورت حال کا لازمی تقاضا تھا کہ وہ حاکمیت الٰہ کے تصور کو غیر معمولی بلند آہنگی اور شدت کے ساتھ سامنے لائے اور مسلسل لاتی رہے۔

(۲) نظام حاضر کی تنقید وتردید

اپنے پیغام کی اشاعت وتبلیغ کے ساتھ ساتھ موجودہ نظام حیات کو جو ملک وملت کی اجتماعی زندگی کی باگ ڈور اپنے ہاتھوں میں لیے ہوئے ہے، برابر چیلنج دیتی اور ذہنوں کو اس کی گرفت سے آزاد کرا لینے کی مسلسل جدوجہد کرتی رہے گی۔اس غرض کے لیے وہ اس نظام کے فطری فساد اور تلخ عملی نتائج کو مضبوط دلیلوں کے ذریعہ نمایاں کرتی رہے گی۔ یہ تنقیدی جدوجہد اس لیے بھی ضروری ہے کہ تحریک کی اپنی خود شناسی اور اپنی تصوراتی عزیمت کا یہ ناگزیر تقاضا ہے اور اس لیے بھی ضروری ہے کہ یہ تحریک اس پوری انسانی زندگی کو بالکل ایک نئے طرز پر تعمیر کرنا چاہتی ہے جس پر یہ نظام اس وقت مسلط ہے ظاہر ہے کہ کسی نئی تعمیر کا پہلا مرحلہ پرانی تعمیر کی بیخ کنی ہی ہوا کرتا ہے۔

(۳) دلیل وبرہان کی زبان

اپنے پیغام اور نصب العین کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے وقت وہ زبان سرتاسر دلیل

اور برہان کی استعمال کرے گی، جیسا کہ ہر دعوت نبوی کا طریقہ رہا ہے ـــــ اس بات کی ضرورت اور اہمیت کی تفصیل اوپر گزر چکی ہے۔

(۴) موعظت حسنہ کا التزام

برہانی اور استدلالی طرز گفتگو ہی کی طرح لب ولہجہ کی سنجیدگی، انداز کلام کی دل آویزی اور دل کا سوز واخلاص بھی دعوت کا ایک ضروری وصف ہوگا۔

(۵) صاف گوئی

تحریک اسلامی جس طرح اپنے نصب العین کے سلسلے میں یکسو اور حنیف ہے، اسی طرح اس کے اعلان واظہار میں بھی کسی ابہام، کسی زمانہ سازی اور کسی مصلحت پسندی کی قطعاً روادار نہ ہوگی ـــــ بے لاگ اظہارِ حق کی یہ روش بلا شبہ بڑی صبر آزما مشکلات کا باعث بنے گی۔ لیکن ایک اسلامی تحریک کے لیے حکمت ودانائی اور عاقبت اندیشی کی بات یہی ہوتی ہے کہ وہ اپنے مقاصد اور اصول کے بارے میں کبھی بھی مصالحت کا راستہ نہ اختیار کرے۔ صرف یہی نہیں کہ اس کی فطرت اس سے اِبا کرتی ہے، بلکہ اس کی کامیابی کے امکانات بھی اس سے تباہ ہوکر رہ جاتے ہیں۔ کیونکہ اس طرز عمل کے نتیجہ میں اگر کوئی، کامیابی حاصل ہوگی بھی تو وہ تحریک کی اور اس کے مقاصد کی کامیابی نہ ہوگی، بلکہ حقیقت میں ان نئی باتوں کی کامیابی ہوگی جنہیں وہ مصالحت کی پالیسی کے نتیجے میں اپنے حقیقی تصورات کو قربان کرکے اختیار کرچکی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ یہ نام نہاد کامیابی نفس تحریک کے لیے بدترین ناکامی ہوگی۔ اب رہا حالات کے دباؤ اور زمانے کی برہمی کا سوال تو اس بارے میں بھی عقل کا فیصلہ اور تاریخ کی شہادت یہی ہے مشکلات اور شدائد کے اندر ہی دعوت حق کی زندگی اور کامرانی کا راز پوشیدہ ہوتا ہے۔

(۶) دعوتی جدوجہد کی ذمہ داری ہر رکن پر

جو شخص بھی اس تحریک کے جماعتی نظام میں شمولیت اختیار کرے گا، اس کی یہ ایک بنیادی اور لازمی ذمہ داری ہوگی کہ اس دعوت کی اشاعت میں خود بھی لگ جائے اور اپنے حالات اور صلاحیتوں کے مطابق بندگان خدا کو اس کی سچی بندگی کی راہ پر لانے کے لیے برابر جدوجہد کرتا رہے۔

(۷) جماعتی تنظیم

تحریک سے باقاعدہ وابستگی اختیار کرنے والے تمام افراد کو ایک مضبوط تنظیمی رشتے میں پرویا جاتا رہے گا اور ہر شخص کے لیے ضروری ہوگا کہ اس تنظیم کی ہدایتوں کی پابندی کرے۔

(۸) ارکان کی تربیت

ارکان تنظیم کی ہمہ جہتی — ایمانی، اخلاقی، نظری اور عملی — تربیت کا مستقل اہتمام رکھا جائے گا۔ تاکہ ایک طرف تو ان کے ذہنوں میں اپنے نصب العین کی حقانیت اور ضرورت کا شعور ہر آن تازہ رہے، دوسری طرف ان کے اندر وہ عزیمت بھی پروان چڑھتی رہے جو اس عظیم نصب العین کی خدمت اور علمبرداری کے لیے بالکل ناگزیر ہے۔

(۹) تنظیم کی صفائی

ارکان تنظیم میں سے جو افراد اخلاقی یا عملی حیثیت سے اتنے خام ثابت ہوں کہ تحریک سے ان کی رسمی وابستگی میں اس کے لیے کوئی افادیت باقی نہ رہ گئی ہو، یا مضرت کے پہلو نمایاں ہوگئے ہوں اور کوشش کے باوجود ان کی حالت میں سدھار نہ پیدا ہو، ان کی رکنیت ختم کردی جائے گی اور ان کی باضابطہ وابستگی سے تنظیم کو پاک کردیا جائے گا۔

(۱۰) اہم ملی مسائل پر توجہ

ملت کے اہم مسائل کو سامنے رکھا جائے گا اور اپنے وسائل کے مطابق مناسب حدود میں ان کے حل کے لیے بھی جدوجہد کی جاتی رہے گی۔

(۱۱) اہم ملکی مسائل پر نظر

ملک کے اہم مسائل بھی نظر میں رکھے جائیں گے، بالخصوص وہ مسائل، جو یہاں کے اخلاقی مستقبل یا تحریک کی مصالح سے گہرا تعلق رکھتے ہوں۔ اس بات کی کوشش کی جائے گی کہ یہاں کے حالات ایسا رخ نہ اختیار کریں جس کے نتیجے میں رہی سہی اخلاقی قدریں اور زیادہ پامال ہوکر رہ جائیں، یا تحریک کی راہ میں نئی دشواریاں اور رکاوٹیں حائل ہوں۔

(بلاشبہ انبیائی دعوتوں کے نقشہ ہائے کار میں اس طرح کی کوئی مہم دکھائی نہیں پڑتی، لیکن اس دور میں جن مخصوص اور غیر معمولی حالات کا ظہور ہو چکا ہے، دینی اصولوں اور مصالح کے لحاظ سے ان کا تقاضا یہی ہے کہ تحریک اپنے اصل دائرے سے باہر کے بھی حالات اور مسائل کا جائزہ لیتی رہے اور ان پر اثر انداز ہونے سے ہرگز دریغ نہ کرے۔ یہ جمہوریت کا زمانہ ہے اور اس ملک میں جمہوری دستور نافذ ہے۔ جمہوریت کی دی ہوئی آزادی فکر و عمل جہاں تحریک کے حق میں اصولاً بڑی خوش آئند چیز ہے، وہاں اس پر یہ ذمہ داری بھی ڈالتی ہے کہ وہ عملاً بھی اسے خوش آئند بنائے رکھنے کی فکر سے غافل نہ رہے اور یہاں کے رجحانات اور حالات کو حتی الوسع ایسا رخ نہ اختیار کرنے دے جو اس کے مستقبل پر ناگوار اثر ڈالنے والا ہو۔ مثلاً یہاں جمہوریت کی جگہ آمریت آجاتی ہے، یا تنگ نظر قوم پرستی اور ہندو احیاء پرستی کو غلبہ حاصل ہو جاتا ہے یا مملکت کی باگ ڈور کمیونزم کے ہاتھوں میں چلی جاتی ہے، یا فرقہ پرستانہ کش مکش بپا رہتی ہے، یا طبقہ واریت کو فروغ ہوتا ہے، تو تحریک کی راہ میں لازماً بھاری دشواریاں حائل ہو جائیں گی۔ چونکہ اسے اپنے کام کا جو نقشہ بنانا اور اپنے مستقبل کے لیے جو کچھ سوچنا ہے، ملک کی حدود میں رہ کر ہی سوچنا اور بنانا ہے، اس لیے اس کے مفاد کا بالکل بدیہی تقاضا ہے کہ یہ ان امکانی خدشات کی طرف سے آنکھیں بند نہ رکھے اور یہاں کے حالات کو ایسا رخ دینے کی کوششوں کے حق میں اپنا وزن ڈالتی رہے جو اس کے مصالح کے حق میں زیادہ سازگار ہو۔)

(۱۲) دوسری جماعتوں سے تعاون

ملی اور ملکی مسائل کے مطلوبہ حل کے لیے اپنے اصولوں کے تحت جہاں تک ممکن ہوگا، تحریک دوسری جماعتوں کا تعاون حاصل بھی کرے گی اور ان سے خود بھی تعاون کرے گی۔

(۱۳) مناسب وقت پر ملکی انتخابات میں شرکت

معقول حد تک مقبولیت حاصل کر لینے کے بعد تحریک اپنے نصب العین کے حصول کے لیے پارلیمانی انتخابات میں شرکت کرے گی اور اس کے ذریعہ ملک کے دستور کو اسلامی بنانے کے لیے اپنی راست کوششوں کا آغاز کرے گی، اس کے علاوہ اگر اہم ملی مفادات یا ملک کے غیر معمولی حالات کا شدید تقاضا ہوا تو ایسی حالات میں بھی وہ انتخابات میں شریک ہونے کا فیصلہ

کر سکے گی تا کہ موجودہ پارلیمانی ذرائع سے بھی وہ ان مفادات کا تحفظ کر سکے، یا ملکی حالات کو کوئی خطرناک موڑ مڑنے سے بچا سکے۔

یہ بات سامنے آ جانے کے بعد کہ تحریک اسلامی ملک میں مطلوبہ تبدیلیاں لانے کے لیے انتخابات کو ذریعہ بنائے گی، اس کے نقشہ کار کے باقی اور خطوط آپ سے آپ سمجھ میں آ جاتے ہیں۔ اس لیے ان کی وضاحت غیر ضروری ہوگی۔

پارلیمانی انتخابات کی راہ سے اسلامی نظام کے قیام کا تصور یقیناً ایک ایسا تصور ہے جس کا انبیائی دعوتوں کی تاریخ میں کوئی نشان نہیں مل سکتا۔ لیکن اس کی وجہ یہ ہرگز نہیں کہ ان زمانوں میں جمہوریت اور پارلیمانی انتخاب کا سسٹم موجود تو تھا مگر حضرات انبیاءؑ نے اس سسٹم کو ہر حال میں ناقابل اختیار سمجھ کر اسے مکمل طور پر رد کر دیا تھا، بلکہ یہ ہے کہ ان دنوں اس سسٹم کا سرے سے کوئی وجود ہی نہیں تھا۔ اس لیے اس کے بارے میں ان کا کوئی اسوہ بھی نہیں پایا جا سکتا۔ ایسی حالت میں آج اگر اس کے متعلق ہم کوئی رائے قائم کرنا چاہیں گے تو اس کے لیے ہمیں تمامتر انحصار اجتہاد فکر ہی پر کرنا ہوگا اور وہی راہ قابل اختیار ٹھہرے گی جو زمانے کے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے دین کے اصول اور دینی مصالح کا تقاضا نظر آئے گی۔ جمہوریت کے اس دور میں جب کہ کسی بھی فکری اور عملی انقلاب کے لیے انتخابات کا راستہ کھلا ہوا ہے اور دوسرا ہر راستہ رد کر دیا گیا ہے، دینی بصیرت کا فیصلہ یہی ہوگا کہ اسلامی انقلاب کے لیے بھی اسی راستہ کو اپنا یا جانا چاہیے اور لازماً اپنایا جانا چاہیے۔

یہ ہیں وہ بنیادی خطوط جن پر تحریک اسلامی نے اپنا نقشہ کار مرتب کر رکھا ہے۔ اسی نقشے پر کام کرتے ہوئے وہ اپنی منزل مقصود تک پہنچنا چاہتی ہے۔ اس سلسلے میں اسے جس طرح یہ غلط فہمی نہیں ہے کہ اس کی راہ کوئی آسان راہ ہے، اسی طرح یہ خوش فہمی بھی نہیں ہے کہ مستقبل قریب ہی میں وہ مبارک گھڑی آ سکتی ہے جب اس کی یہ منزل نگاہوں کے سامنے ہوگی۔ نہیں، اسے خوب معلوم ہے کہ یہ راستہ جتنا دشوار گزار ہے، اتنا ہی طویل بھی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اسے طے کرتے کرتے نسلیں گزر جائیں۔ جیسا کہ ہمہ گیر انقلابی تحریکوں کی تاریخ میں بارہا ہوتا رہا ہے اور حضرت موسیٰؑ وعیسیٰؑ کی دعوتیں بھی اس حقیقت کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اس تحریک کو جن

دشوار اور صبر آزما حالات کا سامنا ہے، جیسے اجنبی ماحول میں وہ کام کررہی ہے، جیسی بھاری ذمہ داریاں اس کے پیروؤں پر عائد ہیں اور جیسی ہمہ گیر تبدیلیاں وہ انسانی زندگی میں لانا چاہتی ہے، ان سب باتوں کے پیش نظر یہ خیال ہرگز نہیں کیا جاسکتا کہ اس کی مقبولیت کا دائرہ تیزی سے پھیل سکتا ہے۔ نہیں، یہ دائرہ تو آہستہ آہستہ ہی پھیلے گا۔ اس کے پاس عام پسند اور دلفریب نعرے نہیں، یہ لوگوں کے سطحی جذبات کو استعمال نہیں کرتی، یہ اندھے جوش ابھار کر اپنے گرد بھیڑ اکٹھا نہیں کرتی، یہ زر اور زمین کا لالچ نہیں دیتی۔ پھر دوسری تحریکوں کی طرح اس کے ارکان کی فہرست طویل ہو تو کیسے ہو؟ اور اس فہرست کو یہ ان طریقوں سے طویل بنا کر حاصل بھی کیا کر پائے گی؟ جب کہ اس کی کامیابی کے لیے ناگزیر ضرورت ارکان کی کمیت سے پہلے ان کی کیفیت کی ہے۔ اس کیفیت سے بہرہ افراد کی بڑی سے بڑی تعداد بھی اس کے لیے بالکل ہیچ ہوگی۔ جیسا کہ امت مسلمہ کی تاریخ آج ایک مدت سے اس حقیقت کا کھلا ہوا مظاہرہ کررہی ہے۔ اس امت کے افراد کروڑوں کی تعداد میں ہیں۔ بیسیوں ممالک میں ان کی بھاری اکثریت ہے اور وہاں انھیں پوری خودمختاری اور اپنا قومی اقتدار حاصل ہے۔ اس کے باوجود کسی بھی مسلمان ملک میں پورا اسلامی نظام قائم نہیں ہے۔ بلکہ ان میں سے کتنے ہی ملکوں میں تو واضح اعلان کے ساتھ غیر اسلامی نظام اختیار کرلیے گیے ہیں۔ یہ اس حقیقت کی ناقابل انکار شہادت ہے کہ جب تک مسلمان نامی افراد میں ایمان کی سچی روح اور اپنے مشن کا حقیقی شعور بیدار نہ ہوگا، اس وقت تک ان کی طویل سے طویل فہرست بھی دین کی اقامت کے مقصد کے باب میں بالکل بے وزن ہی ٹھہرے گی۔ پھر ایسی سچی ایمانی روح اور ایسے بیدار دینی شعور کا پیدا ہونا، جو انسان کو اقامت دین کے اس دشوار گزار راستے پر چلنے اور اس کی منزل دور ودراز کی طرف قدم بڑھانے پر آمادہ کردے، کوئی آسان بات بھی نہیں ہے۔ اس لیے اس دعوت پر لبیک صرف وہی لوگ کہہ سکتے ہیں اور اس کے لیے اپنی زندگیاں برابر وقف رکھ سکتے ہیں جو اس کے حقیقی محرکات کے ساتھ اس سے وابستہ ہوئے ہوں، جو نتائج کی پروا کیے بغیر پورے صبر کے ساتھ مسلسل اپنا کام کرتے جانے کا حوصلہ رکھتے ہوں، جنھیں اس بات کا زندہ یقین ہو کہ یہی سعی وجہد ان کی زندگی کا اصل فریضہ ہے جسے انھیں ہر حال میں بجالانا ہے، جو اس بات کا پختہ عزم رکھتے ہوں کہ چاہے ایک شخص کے بھی کان ان کی پکار کے

لیے نہ کھلیں مگروہ کُوْنُوْا عِبَادَ اللّٰہِ. اور کُوْنُوْٓا اَنْصَارَ اللّٰہِ (الصّف:۱۴) (اے ایمان والو! اللہ کے مددگار بنو) کی منادی سے کبھی باز نہ آئیں گے اور نہ بددل ہوکر کسی دوسری مقبول عام راہ کی طرف مڑ جانے کا وہم تک دل میں لائیں گے، جو اس حقیقت پر مطمئن ہوں کہ تحریک کی کامیابی تو ضرور اس کی مقبولیت پر اور پھر دین حق کے غلبہ اور قیام پر موقوف ہے، لیکن خود ان کی اپنی ذاتی کامیابی صرف اس پر موقوف ہے کہ اپنے بس بھر دین کی سچی پیروی کا اور اس کی دعوت اور اقامت کے لیے جدوجہد کا حق ادا کر جائیں اور جنہیں وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا (العنکبوت:۶۹) (جو لوگ ہماری خاطر مجاہدہ کریں گے انھیں ہم اپنے راستے دکھائیں گے) کے وعدہ خداوندی پر پورا اطمینان ہو۔

تمّت